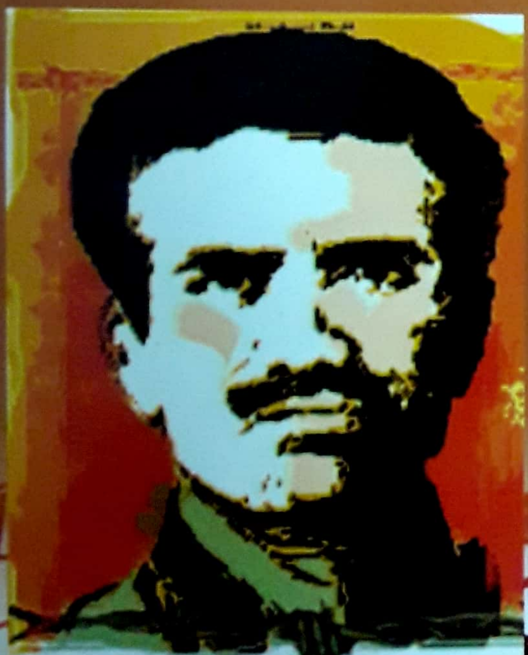
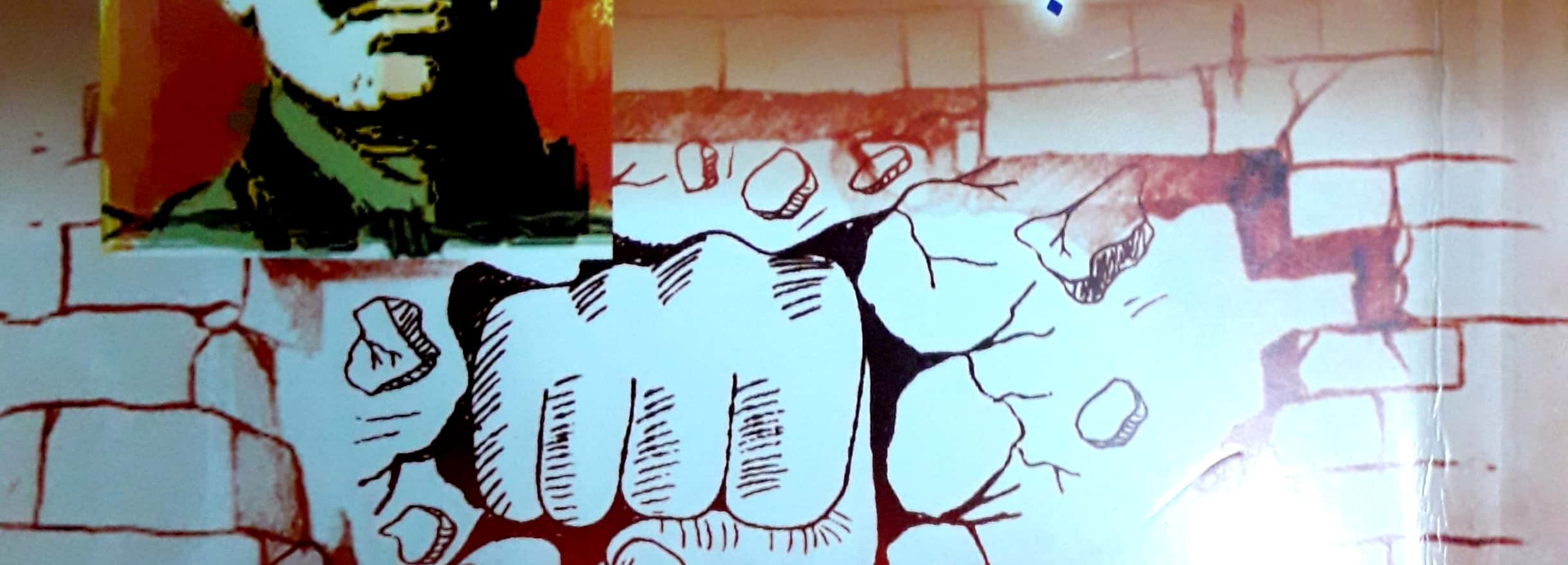
سری نگر جیل سے فرار کی
کہانی

از قلم:

محمد مقبول بٹ





سری نگر جیل سے فرار کی

کہانی

از قلم: محمد مقبول بٹ

حواشی: محمد سعید اسعد

نِکس میر پور

حرفِ آغاز

9 دسمبر 1968ء کی ایک شدید سرد رات کو تقریباً اڑھائی بجے سری نگر جیل کے پہریداروں سے آنکھ بچا کر مادرِ وطن جموں کشمیر کے عظیم آزادی پسند راہنما محمد مقبول بٹ اپنے جیل کے دو ساتھیوں میر احمد (حال مقیم میرپور) اور غلام یٰسین (ساکن لیپا ویلی) کے ہمراہ جیل کی دیوار توڑ کر فرار ہو گئے۔ اور بالآخر اُونچے اُونچے برف پوش پہاڑوں کو طے کرتے ہوئے آزاد کشمیر آ پہنچے۔

مقبول بٹ شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں نے دشمن کی جیل سے فرار ہونے کا یہ منصوبہ کیسے بنایا اور پھر کس طرح بہادری اور دلیری سے نہایت مشکل سفر طے کر کے آزاد کشمیر پہنچے۔ یہ ایک طویل ولولہ انگیز اور ایمان افروز کہانی ہے۔ جسے مقبول بٹ شہیدؒ نے 1972ء میں خود لکھا تھا۔ قبل ازیں یہ کہانی مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہے۔ شہیدِ کشمیر مقبول بٹ کی اس خود نوشت کہانی کو اس بار کتابی صورت میں شائع کرنے کا اعزاز ممتاز کشمیری محقق و مصنف محمد سعید اسعد کے حصے میں آیا ہے۔ محمد سعید اسعد کا نام کشمیر کی نئی نسل کے لئے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ موصوف کی گراں قدر تحقیقی و فکری کاوشیں مسلّمہ ہیں۔ ادارہ نکس کے پلیٹ فارم سے موصوف نے اس تازہ کاوش کو سرانجام دینے کی سعی یقیناً اس لئے کی ہے کہ کشمیر کی نئی نسل کو بتایا جا سکے کہ اگر جذبے توانا ہوں اور عزم و ایمان کی قوت موجود ہو تو انسان اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے راستے میں حائل

ہونے والی بڑی سے بڑی رکاوٹ کو توڑ سکتا ہے اور کوئی ظالم، جابر اور غاصب قوت اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔

یہ کہانی پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ محمد مقبول بٹؒ اور ان کے دو ساتھیوں نے (جو ابھی بقیدِ حیات ہیں) کس طرح بھارتی سامراج کے پہریداروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سری نگر جیل کی دیواروں میں نقب لگائی اور وہاں سے فرار ہو گئے۔ دشمن نے انہیں زندہ یا مردہ پکڑنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن وہ دشمن کے ہاتھ نہ آئے۔ یہ ہمارے وطن کے اُن عظیم آزادی پسندوں کا جذبہ ہی تھا جس نے دشمن کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور اپنے مشن کو کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

محمد مقبول بٹ نے یہ کہانی اُس وقت لکھی تھی جب وہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی ازلی اور حقیقی دشمن حکومتِ پاکستان کے ظلم و جبر کا نشانہ بنے ہوئے تھے اور انہیں گنگا ہائی جیکنگ کے سلسلے میں قید و بند کی اذیّت ناک صعوبتوں سے گزارا جا رہا تھا۔ جدو جہدِ آزادیٔ کشمیر کے اس قافلہ سالار پر استغاثہ کی طرف سے الزام عائد کیا گیا تھا کہ اُس نے بھارتی حکومت سے ساز باز کر کے سری نگر جیل سے فرار حاصل کیا ہے۔ استغاثہ کی اس دروغ گوئی میں شیخ عبداللہ اور قیوم خان برابر کے شریک تھے۔ اِس گھناؤنے الزام کا جواب دینے کے لئے جیل سے فرار کے واقعہ کے اصل حقائق و واقعات تحریری صورت میں منظرِ عام پر لانا ضروری تھا تا کہ تاریخ کا ریکارڈ درست رہے اور دوم وہ اپنی اِس آپ بیتی کے ذریعے کشمیر کی نئی نسل کے دلوں میں ایسا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو جذبۂ آزادی کو نئی طاقت و توانائی عطا کرے۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ گنگا ہائی جیکنگ کے نتیجے میں حکومتِ پاکستان نے اِن عظیم کشمیری حرّیت پسندوں کے جذبۂ حب الوطنی اور جدو جہد آزادی کو بزورِ طاقت کچل کر رکھ دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا تھا۔ پاکستان کی بد نامِ زمانہ خفیہ ایجنسیوں اور بے لگام بیورو کریسی کی پُوری کوشش تھی کہ اِس موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آزادیٔ کشمیر کے ان چراغوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھا

دیا جائے۔ شیطان کے اِن حواریوں کی یہ تدبیریں ایک طرف کارفرما تھیں۔ اور دوسری طرف قدرت کے اپنے فیصلے تھے۔ مقبول بٹ اور اُن کے عظیم ساتھیوں نے ہر قہر و جبر برداشت کیا اور سچائی کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔ اس سچائی جُرأت اور قوتِ ایمانی کے سامنے آمریّت اور سامراجیّت دونوں کو منہ کی کھانا پڑی۔

یہ کہانی کشمیر کی نئی نسل کے لئے نشانِ منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مادرِ وطن کی نئی نسل اگر اپنے دلوں میں ایسا ہی عزم و یقین، ہمت و جرأت اور جذبۂ آزادی پیدا کرلے تو یقیناً وہ وقت دور نہیں رہے گا جب کشمیری اپنے پیارے وطن ''جموں کشمیر'' کی آزادی وخودمختاری کا سورج طلوع ہوتا دیکھیں گے اور کشمیر پر قابض غیر ملکی قوتیں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر یہاں سے بھاگ نکلیں گی۔

کشمیری نوجوانوں اور بچوں سے میں اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو مقبول بٹ شہیدؒ کے مشن کا حقیقی وارث بنائیں اور اپنے وطن کو آزادی کی منزل سے ہمکنار کرنے کے لئے دنیا کی بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرانے اور اُسے شکستِ فاش دینے کا پختہ ارادہ کرلیں کیونکہ جب تک ہماری نئی نسل یہ عہد نہیں کرے گی اُس وقت تک ہمارے ملک پر قابض پڑوسی ملک اپنا قبضہ ختم کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ کشمیر کی نئی نسل اپنے شہید قائد کے ادھورے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنی بہترین ذہنی وجسمانی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے اپنے غلام وطن کو غاصب قوتوں سے نجات دلا کر اسے دنیا کی آزاد اور باوقار قوموں کی صف میں لا کھڑا کرے گی۔

خدا ہمارا حامی و ناصر ہو۔

محمود احمد کشمیری

(بریڈفورڈ)

محمد مقبول بٹ شہیدؒ

شخصیت وجد و جہد

(مختصر تعارف)

تحریر: محمد سعید اسعد

محمد مقبول بٹ شہیدؒ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے ضلع کپواڑہ کی تحصیل ہندواڑہ کے ایک گاؤں ترہگام میں 18 فروری 1938ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام غلام قادر بٹ تھا۔ جو محنت پیشہ آدمی تھے۔ مقبول بٹ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری سکول سے حاصل کی۔ بی اے سینٹ جوزف کالج بارہ مولا سے کیا۔ سکول اور کالج کے زمانے میں مقبول بٹ تحریکی و سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اِس نوجوان کی انہی سرگرمیوں کو دیکھ کر کالج کے عیسائی پرنسپل مسٹر شنکس نے پیشین گوئی کی تھی

''یہ نوجوان کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے گا، یا پھر موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔''

مقبول بٹ نے جب بی اے کا امتحان دیا، اس وقت وادیٔ کشمیر شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے سبب شدید ہنگاموں کی لپیٹ میں تھی۔ چنانچہ بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ 1958ء کو اپنے چچا عبدالعزیز کے ہمراہ جنگ بندی لائن عبور کر کے آزاد کشمیر میں داخل ہو گئے۔ پاکستان کے سرحدی محافظوں نے انہیں پُوچھ گچھ کے لئے مظفر آباد قلعے میں نظر بند کر دیا۔ رہائی کے بعد مقبول بٹ پشاور میں سکونت پذیر ہوئے، جہاں محبت خان نامی ایک کشمیری کی وساطت سے اُنہیں پشاور یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ مل گیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ پشاور سے شائع ہونے والے ایک اخبار ''انجام'' میں بھی کام کرتے رہے۔ اُنہوں نے ایک ہفتہ وار رسالہ ''خیبر ویکلی'' شروع کیا لیکن اُسے مالی مجبوریوں کے سبب جاری نہ رکھ سکے۔ آپ نے پشاور یونیورسٹی سے ایم اے

اُردو اور ایم اے صحافت کی ڈگریاں حاصل کیں ۔ 1961ء میں اُن کی شادی ایک قرابت دار خاتون راجہ بیگم سے ہوئی۔ جن سے یکے بعد دیگرے دو بیٹے جاوید مقبول اور شوکت مقبول پیدا ہوئے ۔ مقبول بٹ نے کے ایچ خورشید کے دورِ صدارت میں 1960ء میں بی ڈی سسٹم کے تحت ہونے والے آزاد کشمیر کے پہلے بلدیاتی انتخابات میں بطورِ امیدوار حصہ لیا اور کامیاب ہوئے ۔ 1965ء میں اُنہوں نے ایک سکول معلّمہ ذاکرہ بیگم سے شادی کی جس سے ایک بیٹی لبنٰی مقبول پیدا ہوئی۔

1965ء میں مقبول بٹ اور اُن کے ساتھیوں نے محاذ رائے شماری کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی ۔ اپریل 1965ء کو سیالکوٹ کے مقام پر محاذ کا پہلا کنونشن منعقد ہوا جس میں مقبول بٹ محاذ کے پبلسٹی سیکرٹری منتخب ہوئے ۔ کنونشن سے فارغ ہونے کے بعد محاذ کے مرکزی عہدے داروں نے سیالکوٹ اور جموں کے مابین سوچیت گڑھ کے بارڈر پر جا کر مقبوضہ کشمیر کی مٹی ہاتھ میں اُٹھا کر حلف اٹھایا کہ وہ اِس دھرتی کی عزت و آزادی کے لئے جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

مقبول بٹ اور اُن کے ایک دوست امان اللہ خان نے 13 اگست 1965ء کو محاذ کے ایک خفیہ مسلح ونگ NLF کی بنیاد رکھی ۔ جس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ کشمیری نوجوانوں کو مسلح تربیت دے کر بھارت کی قابض افواج کے خلاف لڑنے کے لئے تیار کیا جائے ۔ مقبول بٹ نے NLF کے پلیٹ فارم سے کشمیر کی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کے نظریے اور راستے کا تعین کیا۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ آزادی مانگنے سے نہیں ملتی ، بلکہ غاصب قوتوں سے اپنی آزادی چھین کر لینا پڑتی ہے ۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب تک کشمیری ہتھیار اُٹھا کر قابض افواج کے خلاف نہیں لڑیں گے ، اُس وقت تک کشمیر کی آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا ۔ چنانچہ بھارت کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کرنے کے لئے وہ جون 1966ء کو اپنے چند ساتھیوں میجر امان اللہ خان ، صوبیدار کالا خان اور اورنگزیب شہید (ساکن گلگت) کے ہمراہ جنگ بندی لائن عبور کر کے وادیٔ کشمیر میں

داخل ہو گئے جہاں تین ماہ تک وہ خفیہ طور پر تنظیم سازی کرتے رہے اور نوجوانوں کو مادرِ وطن کی آزادی کے لئے عملی میدان میں اُترنے کی دعوت دیتے رہے۔ بالآخر ایک معرکے میں وہ اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گئے اور انہیں سنٹرل جیل سری نگر میں قید کر دیا گیا۔ اُن کا ایک ساتھی اورنگزیب اس معرکے میں شہید ہو گیا۔ مقبول بٹ اور اُن کے ساتھیوں پر بغاوت پھیلانے کے جرم میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ کشمیر ہائی کورٹ کے ایک جج نیل کنٹھ گنجو نے انہیں سزائے موت سنائی۔ مقبول بٹ نے سزائے موت سنانے والے جج کو عدالت کے کٹہرے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''جج صاحب! وہ رسی ابھی تیار نہیں ہوئی جو مقبول بٹ کے لئے پھانسی کا پھندہ بن سکے۔''

مقبول بٹ شہیدؒ سری نگر سنٹرل جیل میں سزائے موت کا فیصلہ سننے سے پہلے ہی جیل سے فرار کے منصوبے پر غور و فکر کر رہے تھے۔ لیکن سزائے موت سننے کے بعد انہوں نے فرار کے منصوبے کو حتمی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے تو انہوں نے جیل میں مقّید اپنے ہم خیال ساتھیوں میر احمد، غلام یٰسین، صوبیدار کالا خان، جمس خان اور گل زمان وغیرہ سے صلاح مشورہ کیا۔ اور طے پایا کہ جیل کے مختصر عملے پر ہلہ بول کر اُن پر قابو پا لیا جائے اور اُن سے ہتھیار اور چابیاں چھین کر جیل کے دروازے کھول دیے جائیں۔ لیکن جس رات اس منصوبے پر عمل کیا جانا تھا، اُس سے پہلے روز جمس خان (ساکن کھرل ملدیالاں باغ) اور گُل زمان (ساکن جُھنڈ گراں مظفر آباد) ڈر اور خوف کی وجہ سے ساتھ دینے سے انکار کر گئے۔ لہٰذا اب محمد مقبول بٹ نے اپنے دیگر دوستوں سے مشورہ کیا اور جیل کی دیواروں میں نقب لگا کر فرار ہونے کا منصوبہ تیار کیا۔ بٹ صاحب اور میر احمد کوٹھڑی نمبر 1 میں بند تھے۔ یہاں سے وہ دیوار میں نقب لگا کر کوٹھڑی نمبر 2 میں داخل ہوئے۔ یہ کوٹھڑی ایک سٹور تھا۔ اسی سٹور سے پھر جیل کی تین فٹ چوڑی اور بیس فٹ اونچی دیوار میں نقب لگائی گئی۔ نقب لگانے کا بیشتر کام میر احمد نے سر انجام دیا۔ 9 نومبر 1968ء سوا دو بجے (18,17 رمضان المبارک کی درمیانی شب)

میر احمد، غلام یٰسین اور محمد مقبول بٹ اس شگاف کے راستے جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

جیل حکام کو سحری کے وقت تقریباً چار بجے گارڈ کی تبدیلی کے وقت اس واقعے کا علم ہوا تو سارا سری نگر شہر ہنگامی سائرن سے گونج اُٹھا۔ ہائی الرٹ کا اعلان ہوا۔ فوج، پولیس اور دیگر حفاظتی دستے مفرور قیدیوں کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔ لیکن بھارت سرکار اپنے تمام تر انتظامات اور طاقت وقوت کے باوجود اِن عظیم حریّت پسندوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہی۔

مقبول بٹ اور اُن کے ساتھیوں نے فرار کا یہ سفر جن کٹھن حالات میں طے کیا، اس کی رُوداد خود محمد مقبول بٹ نے گنگا ہائی جیکنگ کیس کے دوران اسیری کے ایام میں لکھی اس مقدمے کے دوران انہوں نے جو فکر انگیز اور تاریخی نوعیت کا بیان دیا تھا اُس میں انہوں نے سنٹرل جیل سری نگر سے اپنے فرار کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا،

"سولہ روز کا یہ سفر میری زندگی کا تاریخی سفر تھا۔ اس دوران مجھے جن تجربات اور مشاہدات سے سابقہ پڑا میں اِسے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ تصوّر کرتا ہوں۔ جیل سے فرار کی تکمیل میں میرے اپنے ذہن کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ تائیدایزدی کا دخل تھا مگر اِس سولہ روزہ سفر نے میرے ایمان اور اعتقاد کو جلا بخشی۔ جس والہانہ عقیدت اور محبت کے ساتھ میرے وطن کے محکوم عوام نے میرے مشن کی تکمیل میں مجھ سے تعاون کیا اور قدم قدم پر میری دستگیری کی اس کے گہرے نقوش میں اپنے دل و دماغ سے کبھی مٹا نہیں سکتا۔ جس اخلاص اور جذبہ نیک نیتی کے مظاہرے اس دوران میں نے دیکھے ان کی روشنی میں میرا یہ یقین تازہ ہو گیا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب آزادی کا سورج طلوع ہو کر رہے گا اور غلامی کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ مجھے محبت اور تشکر کے وہ آنسو ہمیشہ یاد رہیں گے جو ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف روانہ ہوتے وقت مجھے اور میرے ساتھیوں کو رخصت کرنے والوں کے معصوم چہروں پر قطار اندر قطار گرتے۔ قدرت اس

داخل ہو گئے جہاں تین ماہ تک وہ خفیہ طور پر تنظیم سازی کرتے رہے اور نوجوانوں کو مادرِ وطن کی آزادی کے لئے عملی میدان میں اُترنے کی دعوت دیتے رہے۔ بالآخر ایک معرکے میں وہ اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گئے اور انہیں سنٹرل جیل سری نگر میں قید کر دیا گیا۔ اُن کا ایک ساتھی اورنگزیب اس معرکے میں شہید ہو گیا۔ مقبول بٹ اور اُن کے ساتھیوں پر بغاوت پھیلانے کے جرم میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ کشمیر ہائی کورٹ کے ایک جج نیل کنٹھ گنجو نے انہیں سزائے موت سنائی۔ مقبول بٹ نے سزائے موت سنانے والے جج کو عدالت کے کٹہرے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''جج صاحب! وہ رسی ابھی تیار نہیں ہوئی جو مقبول بٹ کے لئے پھانسی کا پھندہ بن سکے۔''

مقبول بٹ شہیدؒ سری نگر سنٹرل جیل میں سزائے موت کا فیصلہ سننے سے پہلے ہی جیل سے فرار کے منصوبے پر غور و فکر کر رہے تھے۔ لیکن سزائے موت سننے کے بعد انہوں نے فرار کے منصوبے کو حتمی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے تو انہوں نے جیل میں مقّید اپنے ہم خیال ساتھیوں میر احمد، غلام یٰسین، صوبیدار کالا خان، جمس خان اور گُل زمان وغیرہ سے صلاح مشورہ کیا۔ اور طے پایا کہ جیل کے مختصر عملے پر ہلہ بول کر اُن پر قابو پا لیا جائے اور اُن سے ہتھیار اور چابیاں چھین کر جیل کے دروازے کھول دیے جائیں۔ لیکن جس رات اس منصوبے پر عمل کیا جانا تھا، اُس سے پہلے روز جمس خان (ساکن کھرل ملد یالاں باغ) اور گُل زمان (ساکن جُھنڈ گراں مظفر آباد) ڈر اور خوف کی وجہ سے ساتھ دینے سے انکار کر گئے۔ لہٰذا اب محمد مقبول بٹ نے اپنے دیگر دوستوں سے مشورہ کیا اور جیل کی دیواروں میں نقب لگا کر فرار ہونے کا منصوبہ تیار کیا۔ بٹ صاحب اور میر احمد کوٹھڑی نمبر 1 میں بند تھے۔ یہاں سے وہ دیوار میں نقب لگا کر کوٹھڑی نمبر 2 میں داخل ہوئے۔ یہ کوٹھڑی ایک سٹور تھا۔ اسی سٹور سے پھر جیل کی تین فٹ چوڑی اور بیس فٹ اونچی دیوار میں نقب لگائی گئی۔ نقب لگانے کا بیشتر کام میر احمد نے سر انجام دیا۔ 9 نومبر 1968ء سوا دو بجے (18,17 رمضان المبارک کی درمیانی شب)

میر احمد، غلام یٰسین اور محمد مقبول بٹ اس شگاف کے راستے جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

جیل حکام کو سحری کے وقت تقریباً چار بجے گارڈ کی تبدیلی کے وقت اس واقعے کا علم ہوا تو سارا سری نگر شہر ہنگامی سائرن سے گونج اُٹھا۔ ہائی الرٹ کا اعلان ہوا۔ فوج، پولیس اور دیگر حفاظتی دستے مفرور قیدیوں کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔ لیکن بھارت سرکار اپنے تمام تر انتظامات اور طاقت وقوت کے باوجود اِن عظیم حریّت پسندوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہی۔

مقبول بٹ اور اُن کے ساتھیوں نے فرار کا یہ سفر جن کٹھن حالات میں طے کیا، اس کی رُوداد خود محمد مقبول بٹ نے گنگا ہائی جیکنگ کیس کے دوران اسیری کے ایام میں لکھی اس مقدمے کے دوران انہوں نے جو فکر انگیز اور تاریخی نوعیت کا بیان دیا تھا اُس میں انہوں نے سنٹرل جیل سری نگر سے اپنے فرار کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا،

''سولہ روز کا یہ سفر میری زندگی کا تاریخی سفر تھا۔ اس دوران مجھے جن تجربات اور مشاہدات سے سابقہ پڑا میں اِسے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ تصوّر کرتا ہوں۔ جیل سے فرار کی تکمیل میں میرے اپنے ذہن کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ تائیدِ ایزدی کا دخل تھا مگر اِس سولہ روزہ سفر نے میرے ایمان اور اعتقاد کو جلا بخشی۔ جس والہانہ عقیدت اور محبت کے ساتھ میرے وطن کے محکوم عوام نے میرے مشن کی تکمیل میں مجھ سے تعاون کیا اور قدم قدم پر میری دستگیری کی اس کے گہرے نقوش میں اپنے دل و دماغ سے کبھی مٹا نہیں سکتا۔ جس اخلاص اور جذبہ نیک نیتی کے مظاہرے اس دوران میں نے دیکھے ان کی روشنی میں میرا یہ یقین تازہ ہوگیا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب آزادی کا سورج طلوع ہو کر رہے گا اور غلامی کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ مجھے محبت اور تشکر کے وہ آنسو ہمیشہ یاد رہیں گے جو ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف روانہ ہوتے وقت مجھے اور میرے ساتھیوں کو رخصت کرنے والوں کے معصوم چہروں پر قطار اندر قطار گرتے۔ قدرت اس

قدر بے رحم یقیناً نہیں ہے کہ دلوں کی گہرائیوں سے نکلنے والی آہوں اور دعاؤں کو شرفِ قبولیت نہ بخشے۔ میں وہ رقت آمیز منظر کبھی نہیں بھولتا جب وادیٔ کشمیر میں آباد اِس آخری بستی سے میرے چند ہموطنوں نے مجھے رخصت کیا۔ شام کے دھندلکے میں میرے مستقر پر موجود اِن مقامی ساتھیوں اور دوستوں نے جس والہانہ عقیدت، آبدیدہ چہروں اور گلوگیر آوازوں کے ساتھ مجھے الوداع کہا۔ میں اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ انہی کی دعاؤں کا اثر تھا کہ میں دسمبر کی خون منجمد کرنے والی سردی میں 12 اور 14 ہزار فٹ بلند نا قابلِ عبور برف پوش پہاڑوں کو بے سروسامانی کی حالت میں پورے چھ روز کے مسلسل سفر کے دوران عبور کرتا ہوا اس عافیت گاہ میں پہنچ سکا تھا جسے ''آزاد کشمیر'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ میرے ہموطنوں نے لالچ اور سزا کے خوف سے بے نیاز ہو کر جس طرح مجھ سے تعاون کیا ہماری قومی تحریکِ آزادی میں وہ روشنی کا ایک مینار ثابت ہوگا اور آنے والی نسلیں اِسے ایک قابلِ قدر نمونہ تصور کریں گی۔ یہ اس تعاون کا کرشمہ تھا کہ ہماری آزادی کی دشمن طاقتیں مجھے دوبارہ گرفتار نہ کر سکیں اور یوں عوامی تعاون کی مدد سے ہمارے خلاف دشمن کی جوابی کارروائی ناکام ہوگئی۔ *

محمد مقبول بٹ کی اس خودنوشت کہانی کو ہفت روزہ ''کہانی''، ماہنامہ ''حکایت'' اور کچھ دیگر رسائل و جرائد نے اُس زمانے میں شائع کیا تھا۔ یہ کہانی بعد ازاں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی لیکن اِس بار کہانی کو خاصی محنت اور تحقیق کے بعد حاشیہ جات کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ قارئین یہ کہانی دلجمعی سے پڑھیں گے اور پڑھتے ہوئے محسوس کریں گے کہ کشمیر کا یہ عظیم سپوت کس طرح یخ بستہ ندی نالوں، دریاؤں، نہروں، جھیلوں، جنگلوں، پہاڑوں، برف پوش اور فلک بوس چوٹیوں کو کراس کرتا ہوا نہایت عزم و استقلال کے ساتھ دشمن کی قید سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوا۔

* عدالتی بیان محمد مقبول بٹ صفحہ نمبر 22 تا 24، شائع کردہ ڈیفنس کمیٹی برائے ہائی جیکنگ کیس، مطبوعہ 1972

راستے میں قدم قدم پر سختیاں، ناکہ بندی، بھوک، سردی کی شدت اور طوفانِ بادوباراں بھی اُس کا راستہ روک نہ سکے۔ اِس مردِ مجاہد کا ایمان اتنا سچا اور پکا تھا کہ قدرت قدم قدم پر خود اِس کی راہنمائی اور حفاظت کا اہتمام کرتی رہی۔ آپ اِس کہانی میں ایک غریب چرواہے کے گھر محمد مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں کے ٹھہرنے کا واقعہ پڑھیں گے، جس نے سحری کے وقت خواب دیکھا تھا، اور خواب میں اُس کے پیر صاحب نے اُسے خوشخبری سنائی تھی کہ آج تیرے گھر کوئی خاص مہمان آئیں گے، اُن کا خاص خیال رکھنا۔ جب مقبول بٹ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اُس بوڑھے کے گھر داخل ہوئے تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

یہ کہانی جہاں ایک طرف محمد مقبول بٹ شہیدؒ اور اُن کے دوستوں کے عزم و ہمت کی عکاسی کرتی ہے وہاں اہل کشمیر کے فکر و کردار کی ترجمان بھی ہے۔ اِس سفر کے دوران آزادی کے ان متوالے مسافروں کا قاضی ناگ کی بلند و بالا برف پوش چوٹیوں پر استقبال کرنے عید الفطر کا سورج طلوع ہوا تھا۔ مقبول بٹ شہیدؒ نے اس یادگار سفر کی روئیداد لکھتے ہوئے اس موقع پر لکھا ہے۔ ”ہم عید اُس روز منائیں گے جس روز کشمیر آزاد ہوگا“ یہ وہ عزم و کردار ہے جسے راہِ آزادی کے ہر کشمیری مسافر کو پلے باندھنا ہوگا۔

آزاد کشمیر پہنچنے پر محمد مقبول بٹ شہیدؒ اور اُن کے دونوں ساتھیوں کو 25 دسمبر 1968ء کو ایف آئی یو نے مظفرآباد کے بدنام زمانہ بلیک فورٹ میں قید کر دیا اور اُن پر جبر و تشدد کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس موقع کا ذکر کرتے ہوئے مقبول بٹ شہیدؒ نے لکھا ہے۔

”جلد ہی بلیک فورٹ میں، میں ایک نئی صورت حال سے دوچار تھا۔ ایک ایسی صورت حال کہ جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اور سوچ کی نئی نئی راہیں اور دریچے کھلتے گئے۔ میرے لیے یہ سمجھنا دشوار ہو گیا کہ اپنا دشمن کون اور دوست کون ہے۔“؟

ایف آئی یو نے مقبول بٹ شہیدؒ کے مقدمے کی وہ فائل ضبط کر لی جس میں تین سو صفحات پر مشتمل مقبول بٹ شہیدؒ کا لکھا ہوا وہ عدالتی بیان بھی تھا جو انہوں نے کوٹھڑی نمبر 1 کے سیم زدہ فرش پر بیٹھ کر سنٹرل جیل سری نگر میں تیار کیا تھا۔ مقبول بٹ شہیدؒ کی یہ فائل کشمیری قوم کی امانت ہے جسے ایف آئی یو کے ریکارڈ سے کشمیری قوم کے حوالے کیا جانا چاہیئے۔

مظفرآباد کے بلیک فورٹ میں مقبول بٹ اور اُن کے ساتھیوں کو سخت اذیتیں دی گئیں لیکن راہِ آزادی کے اِن متوالوں کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ کچھ عرصہ تشدّد سے گزرنے کے بعد اُنہیں رہائی ملی تو وہ پھر تحریکِ آزادی کشمیر کے لئے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ 1968ء میں مقبول بٹ کو محاذِ رائے شماری کا مرکزی صدر منتخب کیا گیا۔ 31 جنوری 1971ء کو دو کشمیری نوجوان اشرف قریشی اور ہاشم قریشی نے بھارت کا مسافر بردار طیارہ ''گنگا'' اغوا کیا اور لاہور لے آئے۔ گنگا کے اغوا سے مقبول بٹ اور اُن کے سیکڑوں ساتھیوں کو پاکستان کی مختلف جیلوں اور عقوبت خانوں میں جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن اِن حریّت پسندوں کے حوصلے بلند رہے۔

مئی 1973ء میں گنگا کے مقدمے سے رہائی کے بعد مقبول بٹ پھر سرگرمِ عمل ہو گئے۔ اُنہوں نے 1975ء میں آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کے لئے ایبٹ آباد اور مری کے حلقوں سے دو نشستوں پر انتخاب لڑا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ الیکشن مہم میں اُنہوں نے اپنے وطن کی آزادی کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ 1976ء میں مقبول بٹ اپنے دو نوجوان ساتھیوں ریاض احمد ڈار اور عبدالحمید بٹ کے ہمراہ جدوجہد آزادی کو ازسرِ نو منظّم کرنے کے لئے ایک بار پھر جنگ بندی لائن عبور کرتے ہوئے وادیٔ کشمیر میں داخل ہو گئے۔ جہاں ایک معرکے میں اُنہیں ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے کچھ عرصہ بعد اُنہیں تہاڑ جیل دہلی میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں بھارتی سپریم کورٹ نے اُن کی سابقہ سزائے موت بحال کر دی اور پھانسی کا فیصلہ سنایا۔

6 فروری 1984ء کو لندن میں بھارتی سفارت خانے کے ایک اہلکار ریوندر مہاترے کو ''کشمیر لبریشن آرمی'' نامی ایک خفیہ تنظیم کے اہلکاروں نے اغوا کرلیا۔ اغوا کاروں نے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مقبول بٹ اور اُن کے ساتھیوں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب حکومت نے یہ مطالبہ نہ مانا تو اغوا کاروں نے 54 گھنٹے گزرنے کے بعد مہاترے کو قتل کردیا۔ اس اقدام کے فوراً بعد بھارتی حکومت نے مقبول بٹ کو پھانسی دینے کا اعلان کردیا۔ مقبول بٹ کو سزائے موت سے بچانے کے لئے کشمیریوں نے سخت احتجاج کیا، لیکن بھارتی حکومت اپنے فیصلے پر کاربند رہی۔ چنانچہ 11 فروری 1984ء کو اتوار کے روز علی الصبح تہاڑ جیل میں اُنہیں پھانسی دے دی گئی۔ کلّو جلاّد نے پھانسی کا پھندا کھینچا۔ پھانسی کے پھندے پر لٹکتے ہوئے مقبول بٹ کے آخری الفاظ تھے

''میرے وطن تُو ضرور آزاد ہوگا۔۔۔''

مقبول بٹ کی لاش اُن کے ورثا کے حوالے کرنے سے بھارتی حکومت نے انکار کردیا۔ چنانچہ جیل کے مسلمان قیدیوں نے اُنہیں وہیں تہاڑ جیل کے احاطے میں دفن کردیا۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں (حفیظ)

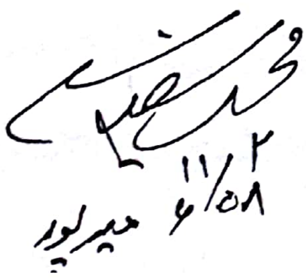
کشمیر کی جدوجہدِ آزادی میں مقبول بٹ شہیدؒ کو سب سے اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے۔ راہِ آزادی میں مقبول بٹ کی قربانی نے کشمیریوں کو نیا عزم وحوصلہ عطا کیا۔ بلاشبہ کشمیر کی نئی نسل میں مقبول بٹ کو جو عزت وقدر ومنزلت حاصل ہے وہ کسی دوسرے شخص کے حصہ میں نہیں آئی۔ نئی نسل مقبول بٹ کو جدوجہد آزادی کا ہیرو سمجھتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مقبول بٹ نے روایتی انداز سے ہٹ کر مصلحتوں اور مفادات کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے صدق وصفا اور خلوص ووفا کا پیکر بن کر کشمیر کی نئی نسل کو

آزادی وخودمختاری کا حقیقی تصوّر دیا اور اس تصوّر کو عمل کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے استقامت واستقلال کی نئی تاریخ رقم کی۔

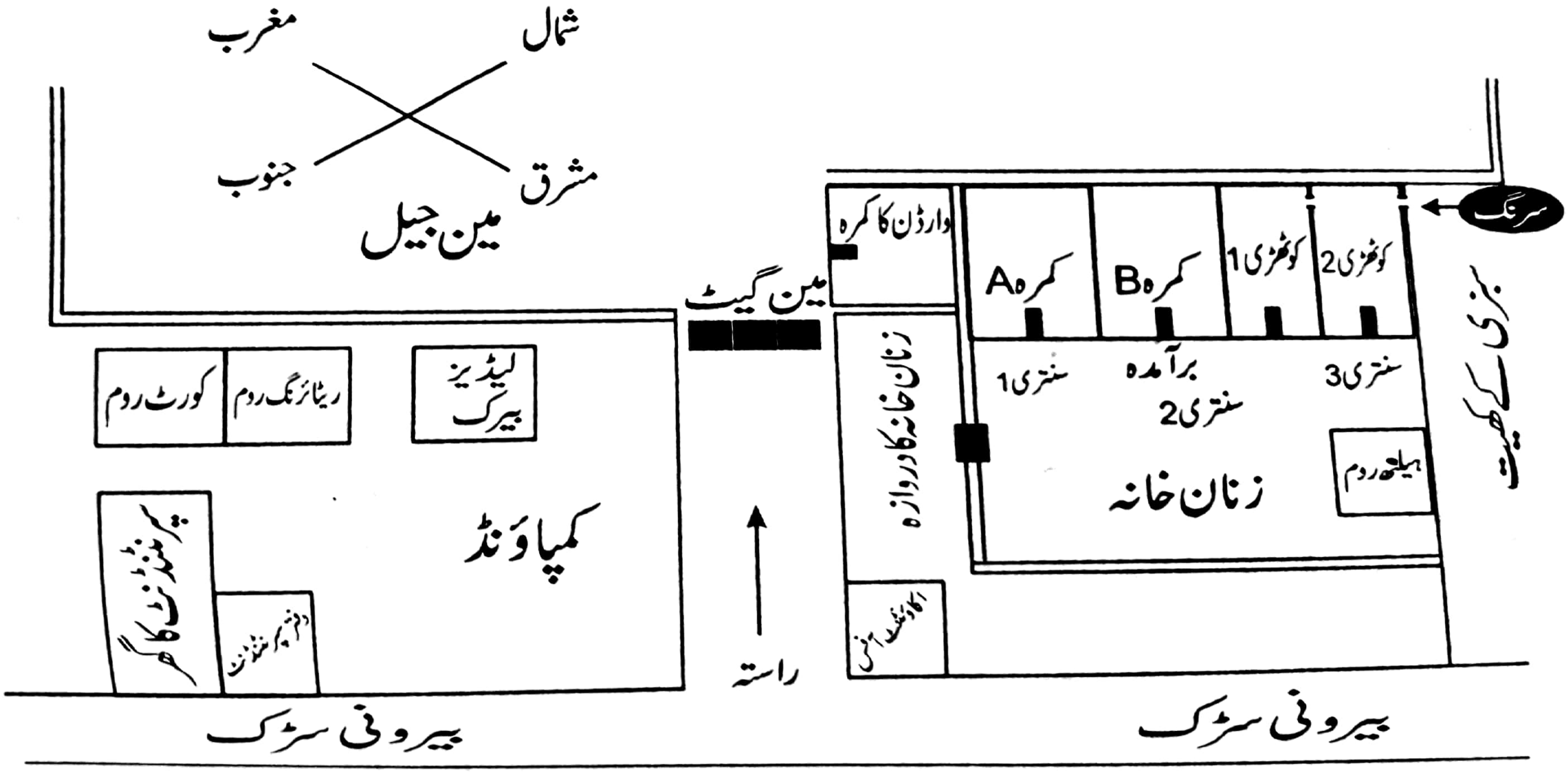
سنٹرل جیل سری نگر سے مقبول بٹ اور اُن کے دو ساتھیوں کے فرار کی یہ تاریخی کہانی چند ضروری وضاحتوں اور حواشی کے ساتھ شائع کی جارہی ہے۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس کی گئی ہے وہاں قارئین کی معلومات میں اضافہ کے لئے فٹ نوٹس میں وضاحت کردی گئی ہے۔ اس کام کے لئے کافی محنت اور عرق ریزی کرنا پڑی ہے۔ میری اس محنت کے بعد یہ کہانی یقیناً زیادہ معلوماتی اور دلچسپ بن گئی ہے۔ تشنگی یا اختصار کا کوئی پہلو باقی نہیں رہنے دیا گیا۔ تاہم اگر قارئین اب بھی کسی بات کی وضاحت محسوس کریں تو وہ اس کی نشاندہی فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں یہ کمی بھی پوری کردی جائے۔

کشمیر کی نئی نسل کے سامنے شہیدِ کشمیر، قائدِ حریّت محمد مقبول بٹ شہیدؒ کی یہ خود نوشت کہانی نئے انداز اور نئے پیرہن میں پیش کرتے ہوئے مجھے بے پناہ قلبی اور روحانی خوشی محسوس ہورہی ہے۔ میری اس کاوش کے نتیجے میں یقیناً کشمیر کی نئی نسل کے قلب ونظر کو جلا ملے گی اور وہ اپنے شہید قائد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے راہ آزادی میں پیش آنے والی مشکلات ومصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے حصولِ منزلِ مراد تک آگے ہی آگے بڑھتے رہیں گے۔ وقت کا کوئی جابر، آمر اور لٹیرا اُنہیں روک نہیں سکے گا۔

(انشاء اللّٰہ)



سری نگر سنٹرل جیل کا نقشہ



سری نگر جیل سے فرار کی کہانی

دشمن کی جیل یا فوجی کیمپ سے فرار کی کوشش حریت پسند ہمیشہ کرتے چلے آئے ہیں اور گوریلا سرگرمیوں میں ایسی کوششوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ سرینگر کی مرکزی جیل سے میرا فرار اتفاقیہ نہیں بلکہ ایک مکمل منصوبہ بندی اور نہایت احتیاط سے وضع کئے ہوئے اپریشن کا نتیجہ تھا۔ جب میں گرفتار ہوا تھا*1 فرار کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا اور 1967ء کے وسط میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس تحریک کے لئے جس میں کام کرنے کی غرض سے میں پاکستان سے مقبوضہ کشمیر میں آیا تھا،*2 میرا فرار ہونا لازمی ہے۔ نیشنل لبریشن فرنٹ کے عسکری بازو کے سربراہ میجر امان اللہ*3 آزاد کشمیر واپس چلے گئے تھے اور میرا جیل سے نکل کر اس بازو کو منظم کرنا ضروری

---

*1 ۔ محمد مقبول بٹ 6 ستمبر 1966 کو بھارتی مقبوضہ کشمیر کے ضلع بارہ مولا کے گاؤں کونیل سے رات کے وقت ایک خونی معرکے کے دوران عبداللہ میر کے گھر سے اپنے ساتھیوں صوبیدار کالا خان اور میر احمد کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے۔ اس معرکے میں ان کا ایک 19 سالہ جانثار ساتھی اورنگ زیب شہید ہو گیا تھا جو گلگت کا رہائشی تھا۔

*2 ۔ مقبول بٹ 10 جون 1966 کو اپنے ساتھیوں میجر امان اللہ خان، حبیب اللہ بٹ، صوبیدار کالا خان اور اورنگ زیب کے ہمراہ دُوڈنیال کے راستے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں دو گروپوں کی صورت میں داخل ہوئے تھے۔

*3 ۔ میجر امان اللہ خان بھارتی مقبوضہ کشمیر کے علاقے ہائی عامہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ دوسری جنگِ عظیم میں برما کے محاذ پر لڑتے ہوئے جاپان کے قیدی بنے۔ رہائی کے بعد وہ شبھاش چندر بوس کی انقلابی فوج انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے۔ 1947 کی جنگ میں انہوں نے کشمیر کے محاذ پر خدمات سرانجام دیں۔ وہ 1964 میں آزاد کشمیر ریگولر فورسز (AKRF) سے میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور پشاور میں سکونت پذیر رہے۔ وہ این ایل ایف کے بانیوں میں شامل تھے۔ انھیں اس تنظیم کے عسکری شعبہ کا سربراہ بنایا گیا تھا۔ 1976 میں وہ ایک حادثہ میں جان بحق ہوئے اور مظفر آباد کے تانگہ اڈاہ قبرستان میں دفن ہیں۔

ہو گیا تھا۔ پہرے کی سختیوں اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ فرار میں باہر کے کسی آدمی سے مدد نہ لی جائے۔ اس فیصلے کی بنیادی وجہ یہ خیال تھا کہ اگر ایسی کوئی کوشش ناکام ہو گئی تو میرے ساتھ ساتھ ان حریت پسندوں کو بھی مصیبت میں مبتلا کر دے گی جو جیل سے باہر تھے اور جن سے میں فرار میں مدد لیتا۔

1967ء کے موسمِ خزاں میں سکیورٹی سے متعلق بعض افراد جو سری نگر جیل میں تھے جیل کے اس حصے میں منتقل کر دیئے گئے، جس میں ہم بند تھے۔ جیل کے اُس حصے کو جہاں ہماری رہائش تھی، زنان خانہ کہتے تھے۔ جسے زنانہ جیل بھی کہتے ہیں۔ *1 اِن قیدیوں میں گُل زمان، *2 جوموس خان *3 اور غلام یٰسین خان *4 شامل تھے۔ اوّل الذکر دونوں 1965ء کی جنگ میں آزاد کشمیر کے علاقے سے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوئے تھے اور غلام یٰسین مقبوضہ کشمیر میں

---

*1 ۔ سرینگر سنٹرل جیل کا زنان خانہ قیدی عورتوں کے لئے مختص تھا۔ عورتوں کو جیل میں بند کرنے کی سزا منسوخ کی گئی تو جیل کے اس حصے کو خطرناک قیدیوں کے لئے مختص کر دیا گیا۔

*2 ۔ گُل زمان آزاد کشمیر کے ضلع مظفر آباد موضع جُھنڈگراں کا رہنے والا تھا۔ یہ ایک رضا کار کی حیثیت سے 1965 کے آپریشن جبرالٹر میں حصہ لینے کی غرض سے بھارتی مقبوضہ کشمیر بھیجا گیا جہاں اُسے گرفتار کر لیا گیا اور سری نگر سنٹرل جیل میں یہ جنگی قیدیوں کی سزا میں پابندِ سلاسل رہا۔

*3 ۔ جوموس خان ضلع باغ کے گاؤں کھرل ملدیالاں کا رہنے والا تھا۔ 1965 میں یہ جنگی قیدی بنا اور سنٹرل جیل سری نگر میں پابندِ سلاسل ہوا۔ بعدازاں یہ جنگی قیدیوں کے تبادلے میں رہا ہو کر آزاد کشمیر آ گیا۔ 75 سالہ جوموس خان بقیدِ حیات ہے۔

*4 ۔ چودھری غلام یٰسین کا آبائی تعلق بھارتی مقبوضہ کشمیر کے موضع ڈوگر پورہ تحصیل ہندواڑہ سے ہے۔ ان کا خاندان 1947 کے بعد ہجرت کر کے نوکوٹ لیپا آ گیا اور یہاں سکونت اختیار کر لی۔ 1965 کے آپریشن جبرالٹر میں وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوئے جہاں گرفتار ہو کر سنٹرل جیل سری نگر میں قید کر دیئے گئے۔ یہ 1968 کو مقبول بٹ کے ہمراہ جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر آ گئے۔ یہ وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی انداز

←

پاکستان کے لئے جاسوسی کے الزام میں گرفتار تھا۔اُن تینوں کا تعلق آزاد کشمیر سے تھا۔اُن کے آنے سے ہماری تعداد چھ ہوگئی۔میرے ساتھ پہلے سے صوبیدار کالا خان 1★ اور میر احمد قید تھے۔2★ ہم بیرک کے کمرہ ''اے'' میں رہتے تھے۔کمرہ ''بی'' کو ہم باورچی خانہ اور غسل خانہ اور رات کے لئے بیت الخلاء کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ان دونوں کمروں کے سامنے بجلی کے بلب تھے،اس کے باوجود باہر سے ہم پر مسلسل اور کڑی نگرانی کی جاتی اور ہر وقت دو سے چار تک محافظ وہاں موجود رہتے تھے۔ایک کے پاس سٹین یا ٹامی گن ہوتی اور تین رائفلوں سے مسلح ہوتے۔یہ محافظ بھارتی فوج کی سکیورٹی سے تعلق رکھتے تھے۔3★

میں تحریکِ آزادیءکشمیر کی مسلح کارروائیوں سے وابستہ رہے۔آج کل یہ گاؤں لیپا کھئی واڑہ میں آباد ہیں۔

1★۔ صوبیدار کالا خان مظفرآباد کے گاؤں ساریاں کے رہنے والے تھے۔انہوں نے 1947 کی جنگ میں محاذِ کشمیر پر اپنی جرأت و بہادری کے جوہر دکھائے۔کشمیر آرمی سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے 1966 میں این ایل ایف میں شمولیت اختیار کی اور مقبول بٹ اور میجر امان اللہ کے ہمراہ وادیٔ کشمیر میں مسلح جدوجہد کے لئے داخل ہوگئے۔امر چند کے قتل کے واقعہ کے نتیجے میں بھارتی سکیورٹی فورسز سے لڑتے ہوئے زخمی گرفتار ہوئے۔سنٹرل جیل سری نگر میں انہیں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔پیرانہ سالی کے باعث انہوں نے جیل سے فرار کے منصوبے میں حصہ نہ لیا۔بعدازاں جنگی قیدیوں کے تبادلے میں وہ واپس آگئے۔حکومتِ پاکستان نے انہیں حراست میں رکھا۔ 29 نومبر 1982 کو جنگِ آزادی کا یہ سپاہی دنیا سے رخصت ہوا۔

2★۔ میر احمد کا آبائی تعلق رفیع آباد ضلع بارہ مولا سے ہے۔یہ 1966 کو 22 برس کی عمر میں مقبول بٹ کے ساتھ جدوجہدِ آزادی میں شریک ہوئے۔سری نگر سنٹرل جیل کو سُرنگ لگانے کا عظیم کارنامہ اسی مردِ مجاہد نے سرانجام دیا۔مقبول بٹ کو موت کی آغوش سے نکال کر لانے والا یہ مجاہد مظفرآباد میں بدنامِ زمانہ FIU کے ہاتھوں بلیک فورٹ میں بے پناہ تشدد کا نشانہ بنا۔بعدازاں 1971 میں گنگا ہائی جیکنگ کیس میں وہ حکومتِ پاکستان کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے۔میر احمد 1974 سے میرپور میں رہائش پذیر ہیں۔نہایت کس مپرسی اور مفلوک الحالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔تحریکِ آزادی کشمیر کے اس دیرینہ مجاہد کی عمر اس وقت 74 برس ہے۔

3★۔ یہ محافظ گورکھا اور مرہٹہ رجمنٹ سے تعلق رکھتے تھے۔

فرار کے لئے ہم نے جو منصوبہ بندی کی اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جیل حکام اور انتظامیہ سے ہمارے تعلقات،

۲۔ محافظ اور پہرے داروں سے ہمارا سلوک،

۳۔ بیرک میں ہماری طرز رہائش،

جہاں تک جیل حکام اور انتظامیہ سے تعلقات کا سوال ہے میری پالیسی یہ تھی کہ انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ ہم نہایت مہذب اور معقول افراد ہیں۔ چنانچہ اُن کے سخت ترین ضابطوں پر بھی ہم مسکراتے ہوئے تعاون کرتے اور کسی بھی وقت میں نے یا میرے ساتھیوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت انہیں یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم جیل کے عام قیدیوں کی طرح انتظامیہ کے لئے کسی قسم کی مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر کسی قسم کی کوئی شکایت ہوتی تو میں نہایت معقول طریقے سے ایک کاغذ سپرنٹنڈنٹ جیل تک پہنچاتا اور شدید اصرار کے بعد ہم نے یہ منوایا کہ وہ جواب تحریری شکل میں ہم تک پہنچائے۔ اس طرح جیل حُکام کو ہم سے کسی قسم کی تکلیف یا عدمِ تعاون کی شکایت پیدا نہ ہوئی۔

جیل کے بالائی حُکام کے بعد ہم نے زیادہ توجہ نیچے والے سٹاف کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے پر مرکوز کی۔ سٹاف میں وارڈن اور نمبردار (پرانے قیدی) بالخصوص شامل تھے اور اسے ہماری خوش قسمتی سمجھئے کہ ان کی اکثریت مسلمان تھی اور سرکاری ملازم ہونے کے باوجود وہ ہم سے تھوڑی بہت رعایت روا رکھتے۔ کبھی کبھار ہمیں اُن میں سے ایک آدھ کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع ملتا اور کوئی محافظ نہ سُن رہا ہوتا تو ہم واضح کرتے کہ جن باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ہمیں گرفتار کیا گیا ہے اُن کا تعلق کسی طور پر لوٹ مار، چوری یا ڈاکہ زنی سے نہیں، بلکہ ہم کشمیر کی آزادی چاہتے ہیں اور غریب عوام کی بہتری کے خواہش مند ہیں جو سیاسی آزادی کے بعد ہی حاصل کی جا سکتی ہے[1★]۔ چند ماہ کی کوشش کے بعد سٹاف میں سے خاص طور پر ہمیں کچھ ایسے ہمدرد مل گئے جو

1★ ۔ محمد مقبول بٹ کا نظریۂ آزادی بڑا واضح اور غیر مبہم تھا۔ وہ سیاسی عسکری اور سفارتی محاذوں پر جدوجہد کے

←

ہمارے چھوٹے چھوٹے بے ضرر کام مثلاً عام جیل میں بند اپنے دوستوں یا ساتھیوں تک پیغامات بھجوانا وغیرہ بخوشی انجام دینے لگے۔1★

جہاں تک محافظوں کا تعلق ہے،ہم اُن سے کسی قسم کی ہمدردی کی توقع نہ رکھتے کیونکہ وہ باقاعدہ مسلح فوج سے آئے تھے اور اپنا فرض پوری مستعدی سے انجام دیتے تھے البتہ ہم انہیں زیادہ سے زیادہ اطمینان پہنچانے کی کوشش کرتے اور کبھی ایسا موقع نہ دیتے کہ اُن کے لئے ہماری نگرانی مشکل ہو۔

نئے آنے والے پہرے داروں کو عموماً یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ ہم نہایت خوفناک قسم کے مجرم ہیں چنانچہ ہماری پہلی کوشش یہ ہوتی کہ اس تاثر کو ختم کریں اور انہیں گھنٹے میں ساٹھ منٹ تک مسلسل ہماری حرکات کے معائنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔اس مقصد کے لئے آپس میں اور موقع ملے تو اُن سے گفتگو میں ہم یہ ظاہر کرتے کہ ہمارے ذہنوں میں بھارتی فوجیوں کے خلاف کوئی دشمنی نہیں اور ہم خود باغی، ڈاکو یا لٹیرے نہیں، سُلجھے اور سنبھلے ہوئے فوجی ذہنیت کے سپاہی اور تنظیم اور نظم وضبط کے نہ صرف خود پابند ہیں بلکہ اپنے پہرے داروں سے بھی اس کی توقع رکھتے ہیں۔ جب کبھی اُن سے بات کرنے کا موقع ملتا میں انہیں یقین دلاتا کہ جہاں تک اُن کی ڈیوٹی کا تعلق ہے اور ہم پر عائد شدہ پابندیوں کا سوال ہے ہم اُن کے لئے مسئلہ بننے کی بجائے از خود اِن پابندیوں کا اہتمام کریں گے البتہ ہم اُن سے مجرموں اور ڈاکوؤں جیسا سلوک نہیں بلکہ اچھے سپاہیوں کے سلوک کی توقع رکھتے ہیں۔چنانچہ جو محافظ بھی آئے ہم نے ہمیشہ اُنہیں خوش رکھا اور

ذریعے ریاست جموں کشمیر کو آزاد اور خود مختار ملک دیکھنا چاہتے تھے۔وہ قومی خود مختاری اور سیاسی آزادی کو ہی تمام آزادیوں کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ان کی سوچ یہ تھی کہ جب تک مملکتِ جموں کشمیر سیاسی آزادی حاصل نہ کر لے اُس وقت تک عوامی فلاح و بہبود، معاشرتی ترقی، قومی خوشحالی، مذہبی رواداری، تہذیبی احیاء، ثقافتی فروغ اور معاشی خود انحصاری کا خواب ادھورہ رہے گا۔

1★۔ یہ پیغام رسانی زبانی یا تحریری طور پر ہوتی تھی۔سگریٹ کی خالی ڈبیوں یا کاغذ کے پرزوں پر پیغامات لکھ کر ایک دوسرے کی طرف بھیجے جاتے تھے۔

اُن کی عزت کی جس کے بدلے میں ہمیں اچھا طرزِ عمل ملا۔

ہم ہمیشہ اپنے محافظوں کو چائے اور تمبا کو پیش کرتے۔ اگر چہ وہ انکار کر دیتے تاہم جواب میں اُنہیں مسکرانا پڑتا۔ ہم جانتے تھے کہ یہ محافظ بھارتی فوج سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے ہم اُن کے سامنے جیل کی پولیس اور عام ریاستی پولیس کا مذاق اڑاتے اور اس طرح انہیں برتری کا احساس ہوتا۔ باتوں ہی باتوں میں ان کے شائستہ رویّے کی تعریف کرتے اور ان کے نظم وضبط کو سراہتے۔ چونکہ ایک صوبیدار میرے ماتحت کام کر رہا تھا★1 اس لئے محافظوں نے سمجھا کہ میں کمیشنڈ آفیسر ہوں۔ چنانچہ بھارتی فوج سے تعلق رکھنے والے سپاہی اور چھوٹے افسر قید میں ہونے کے باوجود فوجی انداز میں میرے لئے مخصوص احترام کا مظاہرہ کرتے۔ ان کو مزید متاثر کرنے کے لئے جب کبھی ان کا کمانڈر (کیپٹن) یا بٹالین کمانڈر (کرنل) معائنے کے لئے آتا تو میں اُسے ہیلو کہتا اور اُس مخصوص انداز میں بات کرتا جس انداز میں ایک فوجی افسر دوسرے فوجی افسر کے ساتھ بات کرتا ہے، خواہ اُس کا تعلق مخالف فوج سے کیوں نہ ہو۔ ایسا کرنے سے باہر کھڑے پہرے داروں پر میں یہ تأثر چھوڑتا کہ میں باغی، ڈاکو یا لٹیرا نہیں، ایک قابلِ اعتماد فوجی افسر ہوں۔ اِس کے علاوہ مہینوں تک میں نے اپنے پہرے داروں کی مخصوص عادات اور ان کے ذہن کی افتاد کا مشاہدہ کیا۔ یہ ایک طویل اور صبر آزما کام تھا، لیکن بہر طور اِسے کرنا پڑا۔★2

میرے ساتھ جو لوگ قید میں تھے ان میں ضبط اور تنظیم پیدا کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ باہم عزت واحترام، اعتماد اور محبت کے جذبات کو بیدار کرنے کے لئے ہم نے مسلسل کوشش کی۔ میں نے ہر قسم کی یاوہ گوئی، اونچی آواز میں ہنسنا، سرگوشیاں کرنا، زور وشور کی بحث اور اختلافی مسائل پر گفتگو کو ممنوع قرار دے دیا کیونکہ اِن سے آپس میں کشیدگی پیدا ہو سکتی تھی۔ میرے ساتھیوں

★1 - یہ شخص صوبیدار کالا خان تھا۔

★2 - اِس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مقبول بٹ انسانی نفسیات کا کتنا گہرا علم اور تجربہ رکھتے تھے۔

نے میری درخواست پر عمل کیا اور یہ طریق کار طے پایا کہ جب کبھی اُن میں کوئی اختلاف پیدا ہو، معاملہ صوبیدار کالا خان کے سامنے پیش کیا جائے اور اگر اس کے فیصلے سے بھی اختلاف ہو تو مسئلہ مجھ تک لایا جائے۔ میرے فیصلے کو خوشدلی کے ساتھ تسلیم کرنا پڑے گا۔ ★1

ایک اور مسئلہ جس پر اختلاف ہوسکتا تھا، کام کاج کی تقسیم تھا۔ میں نے کھانا پکانے اور کپڑے دھونے کے کام ڈیوٹی کے مطابق تقسیم کر دیئے۔ اس کے علاوہ زنان خانے کے صحن میں چھوٹا سا باغیچہ اُگانا شروع کیا تا کہ بیکار وقت میں ذہن اور جسم کو محفوظ رکھا جائے۔ روزمرّہ کے ٹائم ٹیبل میں جسمانی ورزش کے لئے ایک گھنٹے کا وقت بھی مقرر کیا، شام کو ہم سب آپس میں گوریلا سرگرمیوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے اور ہر شخص اپنے سابقہ تجربات دُہراتا۔ میں چاہتا تھا کہ ذہنوں میں مایوسی اور قنوطیّت پیدا نہ ہو اور حوصلے بلند رہیں، ★2 جہاں تک فرار کے منصوبے کا تعلق ہے، میں ان ساتھیوں کو دوسری جنگِ عظیم کے دوران دشمن کی قید سے بھاگنے والوں کی داستان سناتا اور کشمیر کے پس منظر میں فرار کے مختلف طریقوں پر بحث کرتا۔ ★3

1968ء کے وسط تک ہم ذہنی طور پر متفق ہو چکے تھے کہ جیل سے فرار ممکن ہے اور چھوٹی چھوٹی مشقیں اور ڈرامے ترتیب دے کر اور اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنا کر فرار کے منصوبوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتے۔ ہم میں سے کچھ پہرے دار بنتے اور کچھ قیدی اور آپس میں شدید بحثیں ہوتیں کہ مخصوص حالات میں قیدی کیا محسوس کرتا ہے اور پہرے دار کے احساسات کیا ہوتے ہیں

★1۔ میر احمد نے بتایا کہ مقبول بٹ نے ہم سب سے مشورے کے بعد یہ ڈسپلن طے کیا۔

★2۔ تحریکی لوگوں کے ذہنوں میں مایوسی اور قنوطیّت پیدا ہو جائے تو وہ جدوجہد سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اس لئے مقبول بٹ چاہتے تھے کہ وہ جیل میں بھی اپنے ساتھیوں کے حوصلے بلند رکھیں۔

★3۔ میر احمد نے بتایا کہ جیل میں انھیں جو اخبار ملتا تھا ایک بار اس میں بھی ایک ایسی کہانی شائع ہوئی تھی جس میں ایک جنگی قیدی نے نہایت ہمت اور پامردی سے قید کے دن کاٹے۔ بالآخر اُسے قید سے رہائی مل گئی تھی۔ یہ کہانی مقبول بٹ نے جیل میں اپنے ساتھیوں کو سنائی تھی۔

شروع میں ہمیں جیل کے عام باورچی خانے سے کھانا ملتا تھا کچھ عرصہ بعد جب ہمیں دوسری مرتبہ عدالت کے سامنے لایا گیا تو میں نے تحریری درخواست میں کھانے کے خراب اور کھانے کے برتنوں کے انتہائی گندے ہونے کی شکایت کی۔اس کے علاوہ صابن، تیل، کمبل اور چٹائیوں کے ناقص اور کم ہونے کی شکایت بھی کی۔جج نیل کنٹھ گنجو نے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے کی تحقیقات کریگا اور میری تحریری درخواست پر کچھ لکھ کر جسے میں پڑھ نہ سکا، سپرنٹنڈنٹ جیل ★1 کو پہنچا دیا۔اس دن کے بعد ہمیں خشک راشن ملنے لگا اور کھانے پکانے کے برتن اور دوسری چیزیں بھی دے دی گئیں۔اب ہم خود کھانا پکا سکتے تھے۔

بعدازاں جوموس خان، گل زمان خان اور غلام یٰسین کو ہمارے احاطے میں بھیج دیا گیا جنہیں ''سی کلاسیے'' ہونے کی وجہ سے تین روپے روزانہ خوراک کے لئے ملتے تھے۔اس کے علاوہ پانچ روپے ماہوار کپڑوں کا صابن اور سٹیشنری خریدنے کے لئے دیئے جاتے۔ ہر صبح ایک سکھ وارڈر سوداگر سنگھ ہمارے پاس آتا اور کھانے پینے کی چیزوں کے لئے آرڈر لے جاتا۔اس کے علاوہ ہمیں ایک انگریزی اخبار ''انڈین ایکسپریس'' دہلی اور مقامی اردو روزنامہ ''آفتاب'' سری نگر اور سگریٹ بھی دیئے جاتے۔سردیوں میں جلانے اور کمرہ گرم رکھنے کے لئے کوئلہ ملتا تھا۔اس کے ساتھ ہمیں لوہے کی بنی ہوئی ایک بڑی انگیٹھی دی گئی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں بعدازاں ان لوہے کی سلاخوں نے ہمیں فرار میں بڑی مدد دی۔

موت کی سزا

17 اگست 1968ء کو جج نے اپنا فیصلہ دیا۔ ★2 مجھے اور میر احمد کو موت کی سزا اور صوبیدار کالا خان کو عمر قید کی سزا دی گئی۔خیال تھا کہ اب ہمیں علیٰحدہ علیٰحدہ کوٹھڑیوں میں منتقل کر دیا جائے گا۔

★1۔ سپرنٹنڈنٹ جیل محمود قریشی سری نگر کا رہنے والا تھا۔

★2۔ یہ جج نیل کنٹھ گنجو تھا، اُسے 14 نومبر 1989ء کو لبریشن فرنٹ کے مجاہدوں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

لیکن معلوم ہوا کہ سکیورٹی کے لئے ہمیں اسی احاطے میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔صوبیدار کالا خان روم ''اے'' میں اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ رہا۔ مجھے اور میر احمد کو کوٹھڑی نمبر 1 میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ کوٹھڑی بھی زنان خانے ہی میں واقع تھی۔ ہمارے لئے سزائے موت کی خبر جلد ہی جیل میں پھیل گئی اور ہمارے ساتھی رونے دھونے لگے۔زنان خانے میں ہمارے تین ساتھیوں نے بھی ہمیں گلے لگا کر بہت آنسو بہائے۔لیکن میں نے بمشکل انہیں خاموش کرایا۔

زنان خانہ ایک پرانی عمارت پر مشتمل تھا۔جس کی دیواروں پر مٹی کی لپائی نظر آتی تھی۔ لپائی کے نیچے سامنے کی دیوار پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔احاطے کی اندرونی دیواریں ایک اینٹ کی موٹائی پر مشتمل تھیں۔چھت سینماؤں کی طرح ٹین کی اور مخروطی تھی اور اس کے نیچے لکڑی کی چھت تھی۔

روم ''اے'' میں دو کھڑکیاں اور دو دروازے تھے۔ایک دروازہ آنے جانے کے لئے استعمال ہوتا۔دوسرے میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔روم ''بی'' کی دو کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا۔ کھڑکیوں میں قفل پڑے تھے، کوٹھڑی نمبر 1 تنگ و تاریک تھی اور اس میں صرف لکڑی کا ایک دروازہ تھا، جسے بند کرنے پر کوٹھڑی میں مکمل تاریکی ہو جاتی تھی۔کوٹھڑی نمبر 2 سٹور کا کام دے رہی تھی۔اس میں ناقابلِ استعمال اور متروک کمبل، پھٹی ہوئی چٹائیاں اور دوسرا کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ اس کے دروازے کو لکڑی کے تختوں اور میخوں سے بند کر دیا گیا تھا۔روم ''اے'' اور ''بی'' کے فرش پختہ سیمنٹ کے تھے۔کوٹھڑی نمبر 1 کا فرش کچا تھا۔فرش اور دو فٹ کی بلندی تک دیواریں نم اور سیم زدہ تھیں۔

21 اگست 1968ء کو جج کے فیصلے کے خلاف میں نے مقبوضہ کشمیر کے چیف جسٹس کے پاس اپیل کی۔اس کا مضمون تین سو صفحات پر مشتمل تھا اور یہ اپیل میں نے کوٹھڑی نمبر 1 کے سیم زدہ فرش پر بیٹھ کر لکھی تھی۔★1

★1۔مقبول بٹ کے وکیل لطیف قریشی نے انھیں سزائے موت کا فیصلہ سنائے جانے کے بعد مقدمے کا ریکارڈ مہیا کیا اور انھیں خود اپیل تیار کرنے کو کہا۔اس ریکارڈ میں وہ فردِ جرم بھی تھی جو مقبول بٹ اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف حکومت نے عائد کی تھی۔اس میں بہت سے الزامات لگائے گئے تھے جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔امر ←

چند روز کے بعد جیل کے حکام نے میری کوٹھڑی میں لکڑی کے دروازے کے بجائے لوہے کا دروازہ لگوادیا۔ ہمارے مطالبے پر انہوں نے فرش کو پختہ کروایااور دیواروں پر سفیدی پھرادی۔ ہم نے بجلی کے بلب کے لئے کہا لیکن یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سزائے موت والے قیدیوں کے لئے اندرونی روشنی کی اجازت نہیں۔ البتہ رات کے وقت ایک بے ہنگم سی لالٹین سلاخ دار دروازے کے باہر جلا کر رکھ دی جاتی جس سے تھوڑی سی روشنی اندر آجاتی تھی۔ ہماری درخواست پر اُس ٹھیکیدار نے جو دیواروں پر سفیدی کروار ہا تھا، کوٹھڑی کی دیوار میں کپڑے اور قرآن حکیم لٹکانے کے لئے چھ انچ لمبا ایک آہنی کیل گاڑھ دیا۔ دیگر حفاظتی اقدامات سخت کر دیئے گئے چونکہ مجھے اور میر احمد کو سزائے موت ملی تھی اس لئے احاطے میں گھومنے اور بیت الخلاء وغیرہ لے جانے کے دوران ہمیں ہتھکڑیاں لگادی جاتیں۔

فرار کا منصوبہ

اکتوبر 1968ء میں ہم نے باقاعدہ کام کا آغاز کیا۔ اُدھر ہائی کورٹ میں اپیل کا مسئلہ چل رہا تھا اور ادھر میں نے آہستہ آہستہ درج ذیل معلومات جمع کر لیں۔

زنان خانہ جیل کی بیرونی اور بڑی دیوار سے صرف آٹھ فٹ کے فاصلے سے شروع ہوتا تھا۔ جیل کی بیرونی اور بڑی دیوار سے باہر کھیت تھے، جہاں سبزی بوئی جاتی ★1 اور بے ضرر قیدیوں کو

چند کا قتل، غیر قانونی بارڈر کراسنگ۔ بغاوت کی منصوبہ بندی، سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا، حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش، گڑبڑ پھیلانا وغیرہ۔ سزائے موت کے فیصلے کے خلاف یہ اپیل مقبول بٹ نے کوٹھڑی نمبر 1 کے سیم زدہ فرش پر بیٹھ کر کئی روز کی محنت کے بعد تیار کی۔ یہ اپیل تین سوصفحات پر مشتمل تھی۔ یہ اپیل اور مقدمے کا دوسرا ریکارڈ سری نگر جیل سے فرار کے وقت مقبول بٹ اپنے ہمراہ لے آئے تھے جو پاکستان کی خفیہ ایجنسی FIU کے حکام نے ابتدائی تفتیش کے دوران مظفر آباد میں ہی اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔ یہ ریکارڈ تا حال FIU نے واپس نہیں دیا۔ مقبول بٹ کے مقدمے کی یہ فائل اور ان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی اپیل یقیناً ایک قیمتی تاریخی اثاثہ ہے جسے کشمیری قوم کے سپرد کیا جانا چاہیے۔

★1۔ جیل کی دیوار کے باہر کرم، شلجم، مولی وغیرہ کے کھیت تھے۔

مشقت کے لئے وہاں لے جایا جاتا تھا۔ بیرونی اور بڑی دیوار کے باہر کوئی محافظ نہ تھا۔ فرار کے لئے سردیوں کا موسم بہترین تھا۔ کوٹھڑی نمبر 2 جس میں پرانی چیزوں کا سٹور تھا, جیل کی بیرونی دیوار پر ختم ہوتی تھی۔ اس کوٹھڑی کی بیرونی دیوار پر سیمنٹ کا پلاسٹر تھا اور اندر گول پتھر اور اینٹیں اور چونے کا گارا۔ فرش پر اس دیوار کی چوڑائی تین فٹ کے قریب تھی۔ کوٹھڑی نمبر 1 جس میں ہم رہتے تھے اور کوٹھڑی نمبر 2 جس میں سٹور تھا، کے درمیان اینٹوں کی دیوار تھی جس کے دونوں طرف گارے سے لیپ کیا ہوا تھا۔

اکتوبر 1968ء کے آخر میں گُل زمان، جاموس خان اور غلام یٰسین نے جو کمرہ 'اے' میں رہتے تھے، جیل کے حکّام سے احتجاج کیا کہ وہ صوبیدار کالا خان کو جو اُن کی فوج کا افسر ہے، ہمارا کھانا پکاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ اسماعیل نامی ایک مقامی کشمیری کو جس پر جیب تراشی اور چوری کے الزامات تھے، ہمارے باورچی کے طور پر بھیجا گیا۔ اسماعیل سے میں نے مندرجہ ذیل معلومات حاصل کیں۔

ا۔ اینٹوں کی دیوار کو توڑنا نسبتاً مشکل کام ہے۔

۲۔ پتھر کی دیواروں میں سے ایک ایک پتھر نکالنا آسان کام ہے۔

۳۔ پتھر کی دیواروں میں شگاف کرتے وقت اس مسالے کو توڑنا مشکل ہے جس سے پتھر جوڑے جاتے ہیں۔

میر احمد کے ساتھ مل کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ہم کوٹھڑی نمبر 1 اور کوٹھڑی نمبر 2 کی درمیانی مشترکہ دیوار میں شگاف کریں تا کہ بوقتِ ضرورت ہم میں سے کوئی شخص کوٹھڑی نمبر 2 میں جا سکے۔ کوٹھڑی نمبر 2 میں پرانے کمبلوں کے ڈھیر کے وسط سے گزر کر بیرونی دیوار تک پہنچا جا سکتا تھا اور اس دیوار میں شگاف ڈال کر ہم جیل سے باہر نکل سکتے تھے۔ نقشے سے یہ طریقہ بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ★1

★1۔ ملاحظہ فرمائیں سری نگر سنٹرل جیل کا نقشہ بر صفحہ 15۔

ہمارے اندازے کے مطابق کوٹھڑی نمبر 1، اور کوٹھڑی نمبر 2 کے مابین جو دیوار تھی اس میں شگاف ڈالنا ایسا مشکل کام نہ تھا لیکن کوٹھڑی نمبر 2 کی بیرونی دیوار کو توڑنا قریباً ناممکن نظر آتا تھا کیونکہ یہ کوٹھڑی ہی کی نہیں جیل کی آخری دیوار بھی تھی اور اس دیوار کے باہر جیل کے کھیت شروع ہوتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ کوٹھڑی نمبر 1، اور 2 کے درمیان کیئے جانے والے شگاف کو پہریداروں کی نظروں سے کیونکر چھپایا جائے؟

سردیوں کی آمد کے ساتھ ہم نے دیکھا کہ کوٹھڑی کی دیواروں میں نمی اور سیم زیادہ ہوگئی ہے۔ چنانچہ چند کمبل لے کر ہم نے فرش سے لے کر اڑھائی فٹ اوپر تک دیواروں پر لگا دیئے۔ پہرے داروں سے ہم نے یہ کہا کہ نمی سے ہمارے کپڑے خراب ہوتے ہیں۔ ننگی دیواروں میں سے سردی بھی اندر آتی ہے۔ کمبل لگانے سے جگہ گرم ہو جائے گی۔ پہریداروں نے اس پر اعتراض نہ کیا اور اسے معمول کے مطابق سمجھا★1۔ دیواروں کو کمبل سے ڈھانپنے کے بعد ہم جیل سپرنٹنڈنٹ، کمپنی کمانڈر اور بٹالین کمانڈر کے معمول کے مطابق دورے کا انتظار کرنے لگے۔ اِن تینوں اصحاب نے دورہ کیا لیکن اُن میں سے کسی نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی کہ سخت سردی میں لکڑی کے فریم اور سلاخوں والے دروازے سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔ براہِ کرم اس کی جگہ نیا دروازہ لگا دیا جائے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اس پر عملدرآمد کروائے گا۔ اس دوران میں ہم نے اجازت لی کہ موجودہ سلاخ دار دروازے پر ایک کمبل لٹکائیں اور صرف اوپر کے حصے کو ایک فٹ کے قریب کُھلا چھوڑ دیں تا کہ پہریدار اندر جھانک کر دیکھ سکے اور لالٹین جو باہر رکھی ہوتی ہے اس کی روشنی اندر آسکے۔

سوداگر سنگھ ہر شام ہمارے لئے اخبار لایا کرتا۔ دہلی کے اخبار بالعموم شام کو سری نگر پہنچتے اور ہم کو جیل حکام کے سنسر کے بعد رات گئے ملتے۔ اخبار پڑھنے کے بہانے میں دروازے کے پاس کھڑا ہو جاتا اور کمبل کے اُوپر سے کُھلے دروازے سے باہر جھانکتا۔ اخبار پڑھنے کا مرحلہ

دس سے پندرہ منٹ میں مکمل ہو جاتا تھا اور ہمارے پاس چوبیس گھنٹوں میں دس پندرہ منٹ ایسے تھے جن میں کوٹھڑی کے اندر کوئی کارروائی کی جاسکتی تھی۔ بظاہر میں اخبار پڑھتا لیکن دراصل میری ساری توجہ کا مرکز وہ پہریدار ہوتا تھا جو سامنے ڈیوٹی دیتا تھا۔ یہ پندرہ بیس منٹ ہمیں پانچ سے چھ بجے کے درمیان میسر آتے تھے۔

دیواروں میں نقب لگائی گئی

پہلے مرحلے میں ہم نے چوبیس گھنٹے میں سے پندرہ منٹ جو میسر آتے تھے، غنیمت جانا۔ میں دروازے کے پاس کھڑا ہو کر اخبار پڑھتا اور پہرے دار کو دیکھتا۔ میر احمد نے چھ انچ لمبے کیل سے جو ہم نے کپڑے لٹکانے کے لئے دیوار میں لگوایا تھا اور جس کی جگہ ہم نے چھوٹا سا کیل لگا لیا تھا۔ کوٹھڑی نمبر 1 اور 2 کی درمیانی دیوار میں شگاف کا کام شروع کرتا۔ گارے کے ٹکڑے اور مٹی وغیرہ جو دیوار کھودنے سے برآمد ہوتی تھی اُسے چٹائی کے نیچے چھپا دیا جاتا۔ یہ کام اتنی آہستگی سے کیا جاتا کہ کمبل سے ڈھانپے ہوئے دروازے کے دوسری طرف گھومنے والے کسی پہرے دار کو آواز سنائی نہ دے۔

اس کے بعد اینٹیں اکھاڑنے کا مرحلہ سامنے آیا۔ بارہ اینٹیں اکھاڑی گئیں۔ شروع میں جو اینٹیں برآمد ہوئیں انہیں ہم نے اپنے تکیے تلے چھپایا۔ بعد ازاں جب شگاف بڑا ہو گیا اور کوٹھڑی نمبر 2 میں داخل ہونا ممکن ہوا تو اینٹیں، پلاسٹر، گارے اور مٹی وغیرہ کو کوٹھڑی نمبر 2 میں کمبلوں کے نیچے چھپا دیا گیا۔ یہ سارا کام روزانہ پانچ سے لیکر دس منٹ تک ہوتا اور وہ بھی اس شکل میں کہ ہمیں انگریزی اخبار مل جائے اور میں اُسے پڑھنے کے بہانے دروازے کے پاس جا کر بظاہر باہر رکھی ہوئی لالٹین کی روشنی حاصل کرسکوں اور بباطن پہریدار پر نظر رکھ سکوں۔ جب کسی روز اخبار نہ آتا تو کام بند کرنا پڑتا★1۔ چنانچہ یہ چھوٹا سا شگاف جس میں سے ایک شخص بمشکل رینگ کر کوٹھڑی نمبر 2 میں پہنچ سکتا تھا، مکمل کرنے کے لئے ہمیں آٹھ دن لگے۔ چونکہ شگاف کے

★1 ۔ میر احمد نے بتایا کہ دو تین بار ایسا ہوا کہ اخبار نہ آنے کی وجہ سے ہمیں کام بند رکھنا پڑا۔

اوپر کمبل کا وہ پردہ لٹکا ہوا تھا جو فرش سے اڑھائی فٹ تک کمرے کی چاروں دیواروں پر لگایا گیا تھا اس لئے دن میں پہریدار قریب آ کر دروازے کے اوپر سے جھانکتے تو بھی انہیں شک نہ گزرتا۔★1

نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہم نے دوسرے مرحلے پر کام شروع کیا۔ اب کوٹھڑی نمبر 2 کے کمبلوں میں سے جن کا انبار چھت تک لگا ہوا تھا، کوٹھڑی کی بیرونی دیوار تک پہنچنے کے لئے راستہ بنانا مقصود تھا۔ میں نے میر احمد کو غسل خانے سے بلیڈ لا کر دیا، اُس نے کمبل کے ایک گٹھے کو کاٹا اور بہت سے سڑے بُسے، بدبودار اور پھٹے پرانے ناقابلِ استعمال کمبل ہماری کوٹھڑی میں پہنچا دیے۔ ہم نے ان کمبلوں کو بڑی آہستگی اور ہوشیاری سے اپنے بستروں کے نیچے بچھالیا۔ اوپر سے یہ کمبل دکھائی نہ دیتے تھے اور ان کے بچھانے سے کمرے کی سطح اتنی بلند نہ ہوئی تھی کہ باہر سے جھانکنے والا اندازہ کر سکتا۔

اب ہم نے اپنے کام کا وقت بدلا۔ ہمیں کوٹھڑی نمبر 1 میں کوئی کام نہ تھا۔ لہٰذا اخبار پڑھنے والی ترکیب ختم کردی گئی۔ البتہ معمول کے مطابق اخبار لیتے ہی میں دروازے کے پاس چلا جاتا تا کہ کسی کو شک نہ پڑے۔ اب رات کا پچھلا پہر موزوں تھا۔ بارہ بجے سے لیکر دو بجے تک کا وقت نسبتاً محفوظ ثابت ہوسکتا تھا، چنانچہ بارہ بجے تک ہم بظاہر سوئے رہتے اور ایک بجے کے قریب میر احمد دیوار پر لگا ہوا کمبل اٹھا کر شگاف میں سے رینگتا ہوا کوٹھڑی نمبر 2 میں پہنچ جاتا۔ اس دوران وہ اس شگاف میں سے کمبل کا ایک گٹھا میرے حوالے کرتا اور میں اس کے بستر میں ان کمبلوں کو رول کر کے اس طرح بچھا دیتا کہ وہ ڈمی کا کام دے اور اگر کوئی پہرے دار قریب آ کر دروازے پر لگے ہوئے کمبل کے اوپر چھوڑے ہوئے ایک فٹ کے فاصلے میں سے جھانک کر دیکھے بھی تو اُسے شک نہ پڑے۔ ایک سے دو بجے تک میں مسلسل جاگتا اور میرے کان پہریدار کے قدموں کی چاپ کی طرف لگے رہتے۔ بلیڈ اور آہنی کیل ہمارے کل ہتھیار تھے اور اس مرحلے میں ہمیں آٹھ سے دس روز لگے۔

★1۔ سوراخ فرش کے ساتھ سے بنایا گیا تھا۔

تیسرا مرحلہ بہت مشکل تھا۔ اس میں جیل کی بڑی اور بیرونی دیوار میں نقب لگانا مقصود تھا میر احمد کو اس کام میں بیس سے پچیس دن لگے۔ اس مرحلے میں کیل کے علاوہ انگیٹھی سے اکھاڑی ہوئی دس انچ لمبی سلاخ نے ہمیں بہت کام دیا۔ سب سے پہلے کیل کے ساتھ بیرونی ٹیپ اکھاڑی جاتی پھر پتھر کے اطراف کو لوہے کی بڑی سلاخ سے خالی کیا جاتا اور لکڑی کی ایک چھڑی سے جسے ہم نے ایندھن میں سے اٹھایا تھا گرتے ہوئے پلاسٹر کو سہارا دیا جاتا۔ یہ سارا کام نصف شب کے قریب آدھ پون گھنٹے کے لئے ہوتا تھا۔

یکم یا دو نومبر 1968ء کو ہمارے احاطے کے پہریدار تبدیل ہو گئے۔ نئے پہریداروں کا تعلق حسبِ معمول براہِ راست بھارتی فوج سے تھا اور وہ سی۔ آر۔ پی بٹالین مدراس سے آئے تھے۔ سپاہی اور اُن کے چھوٹے افسر نو عمر تھے اور اُردو تو کیا، ہندی بھی پوری طرح نہ بول سکتے تھے۔ یہ لوگ انگریزی پڑھ سکتے تھے یا تامل۔ حسبِ معمول ہم نے انہیں بھی تھوڑے ہی عرصے میں سنجیدگی، متانت اور وقار کا احساس دلایا۔ اُن کی باتوں سے میں نے تھوڑی بہت تامل سیکھنی شروع کی۔ بے چارے میدانی علاقے سے آئے تھے اور جنوب کے گرم موسم کی نسبت سری نگر کا یخ جاڑا برداشت نہ کر سکتے تھے۔ شروع میں ہم نے انہیں اپنی کانگڑیاں پیش کیں۔ بعد ازاں انہیں کوئلہ اور بڑی انگیٹھیاں جیل حکام کی طرف سے مل گئیں۔ رات کے وقت چاروں پہریدار بڑی انگیٹھی میں کوئلہ جلا کر بیٹھ جاتے۔ چائے پکاتے اور گپ لڑاتے۔ یہ سمجھتے کہ کوٹھڑیوں کے اندر قیدی سو رہے ہوں گے۔ اُن کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ہم رات بھر کس کام میں مصروف رہتے ہیں۔

17 نومبر 1968ء کو بھارتی وزیر داخلہ مسٹر چاون نے اعلان کیا کہ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ 12 نومبر 1968ء کے بعد سے اُن سارے قیدیوں کو جنہیں سزائے موت ملی تھی عمر قید میں بدل دیا جائے۔ قیدیوں کو یہ رعایت مہاتما گاندھی کی بیس سالہ برسی کے موقع پر دی گئی۔ بھارت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہزار ہا سزائے موت پانے والے قیدی اس رعایت کی وجہ سے عمر قیدی بن گئے۔ چنانچہ اگلے روز جیل کے سٹاف کے بعض ارکان ہمیں مبارک

باد دینے آئے۔ محافظ پہریداروں اور جیل حکام کا خیال تھا کہ ہمیں اُن کوٹھڑیوں سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے گا★1۔ ہم اس صورتِ حال سے بہت گھبرائے کیونکہ فرار کا تین چوتھائی کام مکمل ہو چکا تھا۔ ہم کوٹھڑی نمبر 1 اور 2 کے درمیان اور کوٹھڑی نمبر 2 اور جیل کی بیرونی دیوار میں سے دو عدد شگاف ڈال چکے تھے۔ ان کی مٹی اور اینٹیں کوٹھڑی نمبر 2 کے کمبلوں کے نیچے چھپائی جا چکی تھیں۔ کوٹھڑی نمبر 2 کے سوراخ کو کمبل کے گٹھے سے اور کوٹھڑی نمبر 1 کے شگاف کو دیوار پر لگائے ہوئے کمبلوں سے چھپا دیا گیا تھا۔

ہم نے جیل سٹاف سے کہا کہ ہمارے لئے کسی دوسری جگہ منتقل ہونے یا یہاں رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ معلوم ہوا کہ باقاعدہ سرکاری احکام بھارتی صدر کی طرف سے آنے تک ہماری حیثیت سزائے موت کے منتظر قیدیوں کی سی رہے گی۔ اس کے باوجود ہم پر سختیاں کم کر دی گئیں اور اب ہمیں باہر لے جاتے وقت ہتھکڑی نہ لگائی جاتی ★2۔ میں نے سوچا ہمیں فرار میں جلدی کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ پہریداروں کی گفتگو سے البتہ میں نے محسوس کیا کہ جنوبی ہند سے آئے ہوئے یہ پہریدار شمالی ہند کی بالادستی سے خوش نہیں۔ جب کبھی میں اُنہیں مدراس کی خبریں سناتا یا اخبار میں سے کسی مدراسی لیڈر کا بیان پڑھتا تو اُن کے چہرے خوشی سے منوّر ہو جاتے۔

نومبر 1968ء کے دوسرے ہفتے میں اسماعیل باورچی کا روم 'اے' کے باسیوں سے جھگڑا ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے جیل حکّام سے کہہ کر اپنا تبادلہ دوبارہ عام جیل میں کروا لیا اور ہم دونوں کے لئے ہمارے بقیہ ساتھیوں میں سے غلام یٰسین کو کھانا پکانے کے احکامات ملے۔ اسی مہینے کے تیسرے ہفتے میں رمضان شروع ہو گیا۔ غلام یٰسین افطار اور سحری کے اوقات میں اور نمازوں کے

★1۔ جیل میں افواہ گردش کرنے لگی کہ مقبول بٹ اور میر احمد کو راجستھان جیل بھیج دیا جائے گا۔

★2۔ میر احمد نے بتایا کہ مقبول بٹ کا خیال تھا کہ جس جرم کی پاداش میں ہمیں سزائیں موت سنائی گئی ہے اس میں ہمیں نرمی یا معافی ہرگز نہیں دی جائے گی، لہذا ہمیں سرنگ لگانے کا کام جلدی سے مکمل کرنا چاہیے۔

وقت کوٹھڑی نمبر 1 آنے لگا، جہاں میں اور میر احمد قید تھے۔ پہریداروں نے ان غیر معمولی اُوقات میں اس کی آمد پر رمضان اور ہمارے مذہبی نظریات کے پیشِ نظر کوئی اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ ہم صبح کی نماز کوٹھڑی نمبر 1 میں پڑھتے اور بعد ازاں قرآن مجید سے میں انہیں جہاد کے بارے میں آیات سناتا، تاکہ انکا حوصلہ بلند رہے۔

پہلے مرحلے میں کوٹھڑی نمبر 1 اور 2 کا سوراخ میرے سامنے مکمل ہوا تھا۔ دوسرے اور تیسرے مرحلے کا کام میر احمد نے تنہا اور مکمل تاریکی میں انجام دیا تھا۔ آخری رپورٹ کے مطابق وہ بیرونی دیوار کا شگاف مکمل کر چکا تھا۔ صرف بیرونی تہہ مصلحتاً چھوڑ دی گئی تھی تاکہ بوقتِ ضرورت اِسے توڑا جائے اور ضرورت سے پہلے باہر سے کوئی شخص دیوار کو ٹوٹا ہوا نہ دیکھ سکے۔ بیرونی دیوار دوہری تھی۔ ایک رات میر احمد اس آخری کام کو انجام دینے گیا اور رینگتا ہوا واپس آیا تو اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''قدرت کو شاید ہماری آزادی منظور نہیں، جیل کی بیرونی دیوار میں ایک پتھر ایسا ہے جو بالکل نہیں ہلتا۔ اب کیا کریں۔ نہ اِس سُرنگ کو بند کر سکتے ہیں نہ اِس میں سے فرار ہو سکتے ہیں۔''

میں نے میر احمد کو تسلی دی اور سمجھایا کہ وہ پتھر کے دونوں اطراف پر کُھدائی کا کام جاری رکھے۔ میر احمد کا خیال تھا کہ اس کام میں تین سے چار روز تک صرف ہونگے۔

اگلے روز یعنی آٹھ اور نو دسمبر کی درمیانی شب میر احمد معمول کے مطابق کام پر گیا اور بڑے پتھر کیساتھ والے پتھر کو کھودنا شروع کیا۔ یہ پتھر نسبتاً چھوٹا تھا۔ اس کے ہلتے ہی وہ بڑا پتھر جو ہماری نقب میں رکاوٹ تھا، پندرہ منٹ کے اندر اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا★1۔ میر احمد خوش

★1۔ جب میر احمد نے سرنگ کا آخری پتھر بھی ہٹا دیا تو جوشِ جذبات میں وہ سرنگ سے گزر کر باہر گیا اور پھر واپس اندر آیا تاکہ یہ اندازہ کر سکے کے اس سے گزرا جا سکتا ہے یا نہیں۔ میر احمد نے اپنے ایک انٹرویو میں ان یادگار لمحات کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے۔ ''سحری کا وہ لمحہ مجھے آج بھی یاد آئے تو جسم کانپ کانپ جاتا ہے۔ جب میں نے پتھر کو راستے سے ہٹانے کے لئے ننگے مکے سے ٹھوکر ماری تھی۔ پتھر لڑھک کر نیچے گرا تھا اور زور سے آواز آئی تھی۔ اس لمحے ہمارے قید خانے کی دیواروں سے زیادہ ہمارا دل دھڑکا تھا۔'' (بحوالہ انٹرویو، میر احمد، نوائے وقت جمعہ میگزین 9 مارچ 1984ء)

واپس آیا۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس کے چہرے پر کس قدر مسرت کے آثار تھے۔ وہ اس قدر جوش میں آیا ہوا تھا کہ مجھ سے لپٹ گیا اور میرا ماتھا چوم لیا۔ دو بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ہم نے دو بجے تک انتظار کیا۔

فرار کی رات آئی

نئے پہریدار آئے اور اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ غلام یٰسین کو کمرہ ا نے سے نکالا گیا اور وہ ہمارے پاس پہنچا تاکہ معمول کے مطابق سحری تیار کر سکے۔ اس نے انگیٹھی میں آگ جلائی۔ ہم نے دودھ گرم کر کے پیا۔ پھر غلام یٰسین نے دروازے کے پاس جا کر سردی کی شکایت کرتے ہوئے دروازے کے کمبل کو اور پھیلا دیا۔ یہ سری نگر کی سردی تھی جسے آپ تصور میں لا سکتے ہیں۔ پہریدار اپنی بڑی انگیٹھی کے گرد حسب معمول آگ تاپ رہے تھے اور ہماری طرف سے بالکل مطمئن نظر آتے تھے۔ ہم نے یٰسین کو پروگرام سمجھایا۔ میر احمد سب سے پہلے سرنگ میں گھسا۔ پھر غلام یٰسین اور بعد ازاں میں۔ اس کام میں صرف پندرہ منٹ لگے۔ ہمارے ساتھ کھانے پینے کی چیزوں میں چار روٹیاں، مکھن کی دو ٹکیاں، تھوڑی سی کھانڈ، ایک پونڈ خشک دودھ، لپٹن ٹی کا ایک پیکٹ، تکیے کے غلاف میں بندھے ہوئے ایک درجن ابلے ہوئے انڈے اور سگریٹ کی ایک ڈبیا موجود تھی۔ میر احمد نے یہ سامان اٹھا رکھا تھا۔ یٰسین کے پاس قرآن حکیم اور نظر بندی کے کاغذات اور سری نگر جیل میں میرے مقدمے کی مکمل فائل تھی اور میرے پاس دو کمبل تھے۔

یہاں ایک لحہ رُک کر ہم نے اُن ساتھیوں کے بارے میں سوچا جو ہمارے ساتھ نہیں آئے تھے۔ گزشتہ چند ہفتوں سے جب سے میں نے اندازے سے فرار کی تاریخ مقرر کی تھی وہ پہلے متذبذب لہجے میں اور بعد ازاں کُھلے بندوں یہ کہنے لگے کہ فرار بہت مشکل ہے اور اتنی شدید سردی میں برف پوش چوٹیوں اور وادیوں کو عبور کر کے آزاد کشمیر تک پہنچنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ چنانچہ آخری مرتبہ اُن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مکمل طور پر انکار کر دیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ منزل کے قریب پہنچ کر وہ پلٹ جانا چاہتے تھے مگر میں اُن سے بحث کرنا پسند نہ کرتا تھا۔

میں نے بار بار اُن سے پوچھا وہ کیوں ہچکچا رہے ہیں؟ اُن کا ایک ہی جواب تھا کہ یہ اقدام خودکشی سے کم نہیں اور ہم کسی طرح جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو زندہ سلامت آزاد کشمیر تک نہ پہنچ سکیں گے۔

میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ انہیں مزید پریشان نہ کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ناراض ہو جائیں یا جذباتی طور پر خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور اس طرح ہمارا بھید ہی کھُل جائے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے آپ ہمارے ساتھ نہیں آنا چاہتے تو نہ سہی لیکن ہم سے اس قدر تعاون ضرور کیجئے کہ اس سلسلے میں آپ کوئی لفظ اپنی زبان پر نہ لائیے۔ آگے ہم جانیں اور ہمارا کام۔ انہوں نے بخوشی اسے قبول کر لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ محض خوفزدہ تھے۔ بھاگنے کا موقع آیا تو ان پر خوف کا ایسا شدید غلبہ ہوا کہ وہ اپنے اندر جرأت نہ پاتے تھے کہ یہ کام کر سکیں گے۔

9 دسمبر 1968ء کو شروع ہوئے دو گھنٹے سے زائد گزر چکے تھے۔ رات کے ٹھیک اڑھائی بجے ہم تینوں، میں، میر احمد اور غلام یٰسین نے دوہری دیوار کی نقب میں داخل ہو کر رینگنا شروع کیا اور چند ہی منٹ بعد ہم جیل کی بیرونی دیوار سے باہر سبزیوں کے کھیت میں کھڑے سری نگر کی تازہ یخ ہوا میں سانس لے رہے تھے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ میں خود اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں اور سارا جسم کسی آہٹ یا کھٹکے کو محسوس کرنے کے لئے پوری طرح مستعد تھا۔ لیکن چاروں طرف سخت سردی میں ٹھٹھرے ہوئے پودوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

سبزیوں کے کھیت سے گزر کر ہم بادام واری پہاڑی کے دامن کی طرف بڑھے اور پندرہ منٹ کے بعد ایک ایسی نہر کے کنارے پہنچے جو ڈل جھیل سے نکلتی ہے اور جس میں شدید منجمد کرنے والا پانی تھا۔ اس نہر کو عبور کر کے ہم سڑک تک پہنچے جو سری نگر سے سورہ گاؤں کو جاتی ہے جو مشہور کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ کا گاؤں ہے۔ یخ بستہ پانی سے گزر کر ہمارے جسم سردی سے اکڑ گئے۔ یہ آزادی کا جذبہ اور ایمان کی حرارت تھی کہ ہم نے سردی کو شکست دی★[1] ورنہ نارمل حالات

★[1]۔ آزادی کا جذبہ اور ایمان کی حرارت دو ایسی نعمتیں ہیں کہ جس شخص کو قدرت یہ عطا کر دے وہ دنیا کے کسی باطل قوت کو کمزور اور خوف کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جیل کی اونچی دیواریں، سخت اور کڑے پہرے، یخ بستہ ندی نالے، فلک ←

میں ٹانگیں بیکار ہو جانا یقینی تھا۔ ہماری دائیں جانب میہان ★1 پہاڑ کھڑا تھا جس کی چوٹی سے ہم اپنی سمت کا اندازہ کر سکتے تھے۔ یہاں ہم نے سڑک چھوڑ دی اور سیب کے باغات میں سے دوسری سمت چلنے لگے۔

اِن باغات سے گزر کر ہم تیل بَل گاؤں میں پہنچے۔ اس گاؤں سے باہر نہر میں بے انداز بطخیں تیر رہیں تھیں۔ ہم دَبے پاؤں وہاں سے گزرے، پھر بھی وہ ہماری آہٹ سے بدکیں اور پھر شور مچانے لگیں۔ ہم گھبرائے کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ گاؤں والوں کو یا کسی پہریدار کو ہماری موجودگی کا علم ہو۔ لیکن گاؤں میں کوئی شخص نہیں جاگ رہا تھا۔ دسمبر کی شدید سردی میں رات کے تین بجے کسی متنفس کا بلاوجہ باہر گھومنا ممکن نہ تھا۔ اس گاؤں سے گزرنے کے بعد ہم سری نگر سے کافی فاصلے پر نکل آئے اور اب ہمیں تسلی ہوگئی۔ یہاں علاقہ اس قسم کا تھا کہ اگر کوئی تعاقب کرتا تو بھی ہم بآسانی کچھ دیر کے لئے کسی جگہ چھُپ سکتے تھے۔

اِس گاؤں کے بعد آزاد کشمیر تک پہنچنے میں کِن کِن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور کس طرح ہم موت اور زندگی کی کشمکش سے گزرے کیونکر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کیا اور کیونکر خدا نے بالآخر کامیاب و کامران کیا۔ یہ ایک الگ داستان ہے جسے میں اگلی کسی نشست کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

(اس داستان کو بیان کرتے وقت خاص طور پر احتیاط سے کام لینا چاہتا ہوں کیونکہ بعض ایسے راستوں، اشخاص اور مقامات کا ذکر دانستہ نہیں کرنا چاہتا کہ حریّت پسندوں کے ہمدردوں کا علم بھارتی حکومت کو نہ ہو جائے اور ابھی تک ایسے لوگ جو اپنی استطاعت کے مطابق بھارتی حکومت سے برسرِ پیکار ہیں یا چوری چھپے حریّت پسندوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں، ان کے نام آشکارہ نہ ہو جائیں۔) (مقبول بٹ)

بوس پہاڑ، جان لیوا گلیشئر زسب جذبہ حُریت اور ایمان کامل کے سامنے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

★1۔ میہان کشمیری زبان میں اُونچے کو کہتے ہیں۔ یہاں کوہِ ہرمُکھ مراد ہے جو سری نگر کے عقب میں سب سے اُونچا پہاڑ ہے۔

مجھے احساس تھا کہ جیل سے ہمارے فرار کو دشمن کی حفاظتی افواج اپنے لئے چیلنج تصوّر کریں گی۔ اور ہمیں گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔اس لئے ضروری تھا کہ آزاد کشمیر تک کے سفر کی منصوبہ بندی ایسے طریقے سے کی جائے جو ہر لحاظ سے محفوظ ترین ہو، چنانچہ میں نے حسب ذیل پیش بندیاں کرلیں۔

ا۔ مقبوضہ کشمیر میں جن لوگوں سے ہماری رشتہ داریاں تھیں یا جن سے ہمارا مسلح جدوجہد کی کارروائیوں کے دوران رابطہ تھا، اُن سے دور رہا جائے۔کیونکہ یہ بات واضح تھی کہ جیل سے ہمارے فرار کے بعد دشمن کی توجہ سب سے پہلے انہی لوگوں کی طرف ہوگی۔

ب۔ اپنے پیچھے اِس قسم کا کوئی نشان نہ چھوڑا جائے جس سے دشمن کو ہمارے سفر کی سمت یا ہماری نقل وحرکت کے بارے میں کوئی اشارہ مل سکے۔

ج۔ اس قسم کا کوئی نشان بھی اپنے پیچھے نہ چھوڑا جائے جس سے دشمن کو یہ پتہ چل سکے کہ ہمیں کسی بھی جانب سے کوئی امداد ملی ہے۔

د۔ عوام سے رابطے سے بھی گریز کیا جائے اور بہت ہی مجبوری کی حالت میں بھی کسی شخص سے رابطہ کرتے وقت حفاظتی انتظامات کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

ہمیں امید تھی کہ ہم پانچ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکیں گے۔باوجود اس کے، کہ طویل عرصہ تک ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے کی وجہ سے ایسا کرنا دشوار تھا۔ میں نے یہ بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ فرار کے بعد ندی نالوں یا جھیل کو عبور کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ دشمن اگر تربیت یافتہ بُو

گیر کتے استعمال کرے تو تعاقب کو غیر مؤثر بنایا جاسکے۔ کیونکہ کتے عام طور پر پانی کے قریب پہنچ کر اپنے شکار یا مفرور کی بُو کھو بیٹھے ہیں۔ میں نے یہ بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ ہمارا سفر دریائے جہلم کے شمالی علاقوں میں سے ہوگا۔ یہ علاقے سری نگر، گاندربل، بانڈی پورہ، سوپور تحصیلوں پر مشتمل ہیں۔ اس علاقے سے میں ذاتی طور پر واقف تھا اور تمام راستوں کا بھی علم تھا۔

کسی مفرور کو گرفتار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے گرد ناکہ بندی کی جائے۔ اِس میں عام سڑکوں، راستوں، گزرگاہوں اور دریائی گھاٹوں پر مخصوص دائرے کے اندر حفاظتی اقدام کرنا شامل ہے۔ ساتھ ساتھ حفاظتی دستے اس علاقے میں وسیع پیمانے پر مفرور کی تلاش میں کونہ کونہ چھان مارتے ہیں اور گھر گھر کی تلاشی لی جاتی ہے۔ اس معاملے میں مجھے یقین تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں انٹیلی جنس کی تمام مشینری کو حرکت میں لایا جائے گا اور اس طرح سے ہماری گرفتاری کے لئے حفاظتی افواج کی پوری پوری مدد کی جائے گی۔ بعد میں ملنے والی اطلاعات سے میری یہ بات سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ ★1

9 دسمبر 1968ء کو سوا دو بجے شب ہم سری نگر جیل سے باہر تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ جب ہم طویل مدت کے بعد سری نگر کی کھُلی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ جیل سے ملحق سبزیوں کے کھیت جو اِن دنوں بالکل خالی پڑے ہوئے تھے، عبور کرنے کے بعد ہم نے پکی دیواروں کو پھاندتے ہوئے مغرب کی طرف مارچ کیا اور جلد ہی ہری پربت کے دامن میں پہنچ گئے۔ بادام واری کو عبور کرتے ہوئے جیل کو ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد جھیل ڈل سے نکلی ہوئی ایک ندی کو عبور کیا جو پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ہم لوگ سری نگر کی ایک مضافاتی بستی کے قریب پہنچ گئے۔

★1۔ بھارتی حکومت نے سری نگر جیل سے فرار ہونے والے ان کشمیری حریت پسندوں کی اطلاع دینے والے کے لئے دس ہزار روپے نقد انعام کا اعلان کیا اور بڑے پیمانے پر سرچ آپریشن شروع کیا۔ اس اعلان کی اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی۔

بستی کے باسی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ہم بڑی احتیاط سے آگے بڑھتے رہے۔ تا کہ آوارہ کتوں کے بھونکنے کیوجہ سے کوئی مشکل صورت حال پیدا نہ ہو جائے۔ہم سری نگر کو سورہ کے قصبے سے ملانے والی سڑک پر پہنچ گئے (سورہ مشہور کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ کی جائے ولادت ہے۔) ہماری جانب کا سلسلہ کوہ جو جھیل کے اُس پار کچھ فاصلے پر واقع تھا، رُخ متعین کرنے میں ہماری مدد کرتا رہا۔ہم نے سڑک کو ترک کیا اور سیب کے باغات کے بیچ میں سے اپنا سفر جاری رکھا۔علاقہ چونکہ ناہموار تھا، کہیں ڈھلانیں کہیں خشک ندی نالے، کہیں کٹی پھٹی غیر ہموار سطح زمین تھی۔چنانچہ ہماری رفتار خاطر خواہ نہ تھی۔تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم نے ایک ٹیلے پر تھوڑی دیر آرام کیا۔ایک ایک انڈہ اور پراٹھے کا ایک ایک ٹکڑا کھایا۔چار بج چکے تھے اور ابھی تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔میرے اندازے کے مطابق زنان خانے کے گارڈز کی تبدیلی کا وقت ہو گیا تھا۔ وہاں ہر دو گھنٹے بعد گارد تبدیل ہوتی تھی۔آنے والے گارڈز نے ہمارے سیل پر نظر ڈالی ہو گی اور ہمیں موجود نہ پا کر کہرام مچ گیا ہو گا۔

ہم نے کپڑے تبدیل کیے۔میرا فرن غلام یٰسین نے پہنا۔(فرن ایک کھُلا کرتا نما کشمیری لباس ہے)★ اس نے مجھے اپنا شکاری ٹائپ کوٹ دے دیا۔جس میں بڑے بڑے بکسوئے لگے ہوئے تھے اور جس کے ساتھ ٹوپی بھی منسلک تھی۔اس کے ساتھ میں نے ایک پتلون نما گرم پاجامہ پہنا۔کپڑے تبدیل کر کے ہم اس ٹیلے سے روانہ ہوئے اور طے شدہ سمت میں سفر جاری رکھا۔تقریباً 45 منٹ بعد ہم تیل بَل گاؤں میں پہنچے۔ہم ایک ندی کے کنارے سفر کر رہے تھے جو ہمیں سیدھا گاؤں کے وسط میں لے گئی۔ندی میں بطخوں کی ایک بڑی تعداد پانی کی سطح پر تیر رہی تھی۔جوں ہی ہم قریب پہنچے بطخوں نے شور مچانا شروع کیا۔بہر حال ہم اُن کے پاس سے گزرتے ہوئے گاؤں کے وسط میں پہنچے اور ایک مُعلّق پُل کے ذریعے ندی کو عبور کیا۔

★۔فرن ایک مخصوص قسم کا ڈھیلا ڈھالا کرتا ہوتا ہے جو موٹے اور گرم کپڑے کا بنا ہوتا ہے۔سردیوں میں خاص وعام اسے پہنتے ہیں۔یہ سخت سردی سے جسم کو بچاتا ہے۔کشمیری زبان کا لفظ ''فِرَن'' فارسی لفظ ''پیرھَن'' کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

گاؤں کی مسلمان آبادی سحری کھانے کے لئے بیدار ہو چکی تھی اور کچھ لوگ ہاتھ منہ دھونے کے لئے ندی کنارے آنا شروع ہو گئے تھے۔ کشمیر میں یہ عام رواج ہے کہ لوگ وضو کرتے ہوئے کلمہء شہادت پڑھتے ہیں۔ ہم ندی عبور کر چکے تھے اور ندی کے دوسرے کنارے آگے بڑھ رہے تھے کہ ہم نے ایک آدمی کو وضو کرتے ہوئے اور کلمہ دہراتے ہوئے سُنا۔ ہم تینوں رُک گئے وہ شخص وضو کر نے سے فارغ ہو کر ہمارے قریب آیا اور سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ اس نے سادگی سے سوال کیا، تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ہم پیچھے کے ایک گاؤں سے آرہے ہیں اور ہمیں شال کوٹ جانا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ شال کوٹ کا گاؤں اسی راستے پر پہاڑی کے اُس طرف واقع تھا۔ بغیر توقف کئے میں نے مزید کہا: "دوست ہم اس گاؤں میں پہنچ کر راستہ بھول گئے ہیں۔ کیا تم ہمیں اس گاؤں سے باہر کچی سڑک تک لے چلو گے؟"

وہ فوراً ہی آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ ہم تینوں اُس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ چند منٹ کے اندر ہی ہم گاؤں سے باہر تھے اور شال کوٹ کو جانے والے راستے پر گامزن۔ ہمارے رہبر نے سحری کھا کر جانے کی پیش کش کی لیکن میں نے کہا کہ ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔ ہم نے شمال کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور سلسلہء کوہ کے دامن میں پہنچ کر ہم مغرب کو مڑ گئے۔ اب دن چڑھ آیا تھا لیکن سردیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے لوگ گھروں کے اندر رُکے ہوئے تھے۔ ہم کچی سڑک پر آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ آٹھ بجے کا وقت ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ اپنے روزمرّہ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ راہ جاتے لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لئے ہم نے پھر سڑک کو ترک کیا اور پہاڑوں کے دامن میں چلنے لگے۔ چلتے چلتے ہم ایک نہر تک پہنچ گئے۔ یہ نہر گاندربل کے پن بجلی گھر سے نکلتی ہے۔★1 کچھ دور تک ہم نے نہر کے کنارے اپنا سفر جاری رکھا۔ اب پہاڑی سلسلہ ہمارے دائیں ہاتھ پر تھا۔ بائیں ہاتھ نیچے آبادی تھی۔ اس وقت سورج خاصا بلند ہو چکا تھا اور آگے بڑھنا خطرات سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ دن کو کہیں چھپنے کی جگہ کی تلاش ایک مسئلہ بن کر سامنے آیا۔

★1۔ گاندربل کے پن بجلی گھر سے نکلنے والی یہ نہر ضلع ہندواڑہ کو سیراب کرتی ہے۔

ہم نے نہر کا کنارہ چھوڑ دیا اور اپنے دائیں ہاتھ ایک پہاڑی راستے پر چل پڑے۔ جو پہاڑی کی چوٹی تک لے گیا۔ یہاں ایک برساتی نالے کے اندر بڑی چٹانوں کے پیچھے کچھ دیر آرام کیا۔ اتنے میں ایک شخص جو شکل وصورت سے گجر معلوم ہوتا تھا، ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اُس نے ہمیں دیکھا اور گزر گیا۔ میں نے غلام یٰسین سے کہا کہ اس آدمی کو واپس بلالو۔ یٰسین تیزی سے گیا اور اسے واپس لے آیا۔ اُس شخص نے آ کر سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ وہ مجھے خاص قسم کے شہری لباس میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ میں نے اُس کا نام اور سکونت پوچھی۔ اُس نے اپنا نام نیک محمد بتایا۔ اُس کا گاؤں نزدیک ہی پہاڑی کے دامن میں تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی کے ہم کوئی خطرناک لوگ نہیں ہیں۔ ہم شکار کی غرض سے اِس طرف آئے ہیں۔ ہم کچھ دیر آرام کرنا اور کچھ کھانے کا بندوبست کرنا چاہتے ہیں۔ اُس نے بلا حیل وحجت اپنی خدمات پیش کیں اور ہمیں اپنے گھر لے گیا جو دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

ہم نے کچھ دیر اُس کے گھر میں آرام کیا، چائے بنوائی اور پراٹھے کے ساتھ پی۔ وہ تقریباً دو گھنٹے اپنے گھر میں ہمارے ساتھ رہا۔ میں نے نیک محمد کو بتایا کہ ہم پہاڑ کو عبور کر کے دوسری طرف وادی میں جانا چاہتے ہیں۔ اُس نے جنگل کی ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ کیا جو ہمیں پہاڑ کے اس طرف پہنچائے گی۔ اُس کی بیوی ایک قدامت پسند عورت تھی۔ رمضان کے مہینے میں ہمیں کھاتے پیتے دیکھ کر بُرا مان گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جلد سے جلد ہم سے چھٹکارا چاہتی ہے۔ چنانچہ دن کے بارہ بجے ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔ نیک محمد گجر گھنے جنگل میں کچھ دور تک ہمارے ساتھ جانے کے بعد واپس چلا گیا۔

ہم نے ایک پہاڑ پر چڑھائی شروع کی۔ دو سالہ اسیری کے بعد اس قسم کے تجربے سے دوچار ہوتے ہمیں کچھ مشکل پیش آ رہی تھی۔ سورج غروب ہونے تک ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ایک بہت بڑی باہر نکلی ہوئی چٹان کے سامنے ہم رُکے۔ شام ہو چکی تھی۔ ہم نے کچھ لکڑیاں جمع کیں اور آگ جلا کر شب بسری کے لئے آرام سے بیٹھ گئے۔ آسمان پر بادل گھر آئے تھے کچھ

بوندا باندی بھی ہونے لگی تھی۔ لیکن ہم بہت تھک گئے ہوئے تھے۔ بے سُدھ ہو کر سو رہے۔

10 دسمبر 1968ء کو رات کے دو بجے میں نیند سے بیدار ہوا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چھ انچ موٹی برف کی تہہ نے ساری زمین کو ڈھانپ لیا ہے۔ اور اب بھی برف جاری ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو نیند سے بیدار کیا، کچھ دیر ہم نے انتظار کیا، پھر چائے بنا کر پی اور دوبارہ چڑھائی چڑھنا شروع کی۔ برف میں سفر کے لئے ہمارے پاس مناسب سامان موجود نہ تھا۔ ہمارے پاؤں برف سے جلنے لگے اور اوپر چڑھتے ہوئے ہم اپنے راستے سے بھٹک گئے۔ برف نے سارے علاقے کو یکساں کر دیا تھا۔ بہر حال تقریباً دو گھنٹے کی مشقت کے بعد ہم آخری چوٹی پر پہنچ گئے۔

ابھی صبح طلوع نہیں ہوئی تھی۔ اور شمال کی برفانی ہوا نے ہمیں منجمد کر کے رکھ دیا تھا۔ راستے کا کہیں نام و نشان تھا نہ دور تک کسی بستی یا آبادی کا نام و نشان نظر آتا تھا۔ ہم رُک بھی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ اس طرح پاؤں کے بالکل ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ (برف کے مارے ہوئے ہاتھ پاؤں ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جایا کرتے ہیں)۔ بسیار تلاش اور تگ و دو کے بعد میں نے ایک غار نما جگہ تلاش کر لی۔ جو دو متصل چٹانوں کے سرے مل جانے سے بن گئی تھی۔ اپنے آپ کو طوفانی یخ بستہ ہواؤں سے بچانے کے لئے ہم اس غار کے اندر چلے گئے۔ غار میں رُکنے کے باوجود پاؤں کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے ہم مارک ٹائم کرتے رہے۔ اور صبح ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ فی الحال آگے بڑھنا بے کار ہوگا۔ آگے درپیش وسیع و عریض جنگل میں بھٹک جانے کا ڈر تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس روٹی بھی ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ ہم نے واپس نیچے وادی میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے ہی نقشِ قدم پر واپس لوٹ کر تقریباً تین گھنٹے بعد اسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہم نے آگ جلا کر کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو گرمایا تھا۔ برف باری رُک چکی تھی۔ ہم نے اترائی جاری رکھی۔ دوپہر تک ہم برفانی علاقے سے نکل آئے۔ نیچے شفاف فضا میں وادی صاف نظر آ رہی تھی۔ پکی سڑکیں اور بہتی ہوئی ندیاں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ نیچے کے میدانوں میں رات کو بارش ہو چکی تھی۔ ہم نے ڈھلوان کی

طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ اور سہ پہر کو ایک ترائی میں پہنچے جہاں سے چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا کشمیری گاؤں نظر آ رہا تھا۔ یہ ڈگنی بَل تھا۔

میں نے گاؤں کے کنارے الگ تھلگ ایک مکان پر نظر ڈالی اور اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ آج ہماری منزل یہ ہے۔ یہ ایک منزلہ گھر تھا، جس کی مٹی کی چھت صاحب خانہ کی غربت کی غمازی کر رہی تھی۔ ہم جھاڑیوں کے پیچھے چُھپ کر افطار کے وقت کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ شام ہوئی اور گاؤں کے لوگ روزہ کھولنے کے لئے اپنے اپنے گھروں کے اندر چلے گئے۔ ہم نیچے اترے اور تاریکی میں اس غریب دہقان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آیا اور ہم سے ہماری آمد کا مقصد پوچھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ہم بہت دور سے آئے ہیں اور ابھی پہاڑی کو عبور کر کے اِس طرف پہنچے ہیں۔ ہم لوگ برف باری اور بارش میں سفر کی وجہ سے بہت تھک گئے ہیں۔ کچھ دیر اس کے گھر آرام کرنا چاہتے ہیں۔ غریب دیہاتی ہمیں اچھی حیثیت کے لوگ تصوّر کر کے آتش دان کے قریب لے گیا۔ میں نے اُسے بتایا کے ہم شکاری ہیں۔ اس نے ہمیں بغیر دودھ کے کشمیری نمکین چائے پیش کی۔ ہم آرام سے بیٹھ گئے اور گپ شپ شروع کی۔

ہمارا میزبان چرواہا نکلا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کل صبح سحری کے وقت اُس نے خواب میں اپنے پیر صاحب کو دیکھا تھا۔ پیر صاحب نے اُس سے کہا تھا "دیکھو آج تمہارے گھر کچھ مہمان آئیں گے۔ اُن کا خاص خیال رکھنا"۔ چنانچہ بوڑھے چرواہے نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی۔ گرم پانی سے ہمارے پاؤں دھوئے (کشمیر میں گرم پانی سے مہمان کے پاؤں دھونا بہت بڑی عزت خیال کی جاتی ہے اور اسطرح مہمان کے سفر کی ساری تھکان اُتر جاتی ہے) اس نے گرمیوں میں خشک کیے ہوئے ساگ کی ترکاری کے ساتھ ہمیں چاول کھلائے۔★ رات کو میر احمد اور غلام یٰسین گہری نیند سو گئے۔ لیکن میں اپنے میزبان بوڑھے چرواہے کے ساتھ بڑی دیر تک باتیں

★۔ میر احمد نے بتایا کہ بوڑھا میزبان بہت نیک دل آدمی تھا۔ وہ ہمیں اپنے پیر صاحب کے بھیجے ہوئے مہمان سمجھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے نہایت خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے ہماری آؤ بھگت کی۔

کرتا رہا۔ بیچارہ مجھے اپنی پریشانیوں کے بارے میں سُناتا رہا۔

تقریباً دو بجے شب ہم جاگ اُٹھے۔ ہاتھ منہ دھویا، بوڑھے میزبان کے ساتھ سحری کھائی اور نماز ادا کی۔ مجھے اب اپنے اُس عمر رسیدہ محسن کا نام یاد نہیں رہا۔ اتنا یاد ہے کہ وہ گاؤں قصبہ آسُ ٹینگنُ سے شمال مشرق کی جانب چند فرلانگ پر واقع تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے شہر کے لئے پینے کا پانی مہیا ہوتا ہے۔

11 دسمبر 1968ء کو ہم غریب چرواہے کی کُٹیا سے صبح ہونے سے پہلے ہی تاریکی کے پردے میں روانہ ہوئے۔ وہ ہمیں اُس راستے تک لے آیا جو کہ سری نگر سے گاندربَل جانے والی سڑک تک جاتا تھا۔ ہم نے جنوب کی طرف پیش قدمی جاری رکھی اور گاندربَل سے نکلنے والی اَپر لیول کینال تک پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم دائیں ہاتھ مُڑے اور نہر کے کنارے کنارے گاندربل پاور ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ ہمارے دائیں ہاتھ سلسلہ کوہ تھا اور نیچے دور گہرائی میں غریب کسانوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ ہماری بائیں جانب مکئی کے کھیت تھے۔ جو ان دنوں بالکل خشک تھے۔ اس کے علاوہ سیب کے باغات تھے۔ ہم نے پَو پھٹنے تک سفر جاری رکھا۔ اب ہم جس علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے اس علاقے میں سرکاری حفاظتی انتظامات وسیع پیمانے پر ہونے کا بہت احتمال تھا۔ گاندربَل کا قصبہ پاور اسٹیشن ہونے کے علاوہ علاقے کی انتظامیہ کا مرکز بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے فرار کے بعد اس علاقے میں بھی سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے ہوں گے۔

اِسے ہماری خوش بختی کہیے کہ اچانک بارش شروع ہوگئی۔ اور سارے علاقے کو کُہر کی گہری تہہ نے اس طرح چھپالیا کہ پچاس گز سے آگے دیکھنا محال ہوگیا۔ یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لئے غیبی امداد تھی★۔ ہم نے بارش اور کُہر کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور سفر جاری رکھا۔ تقریباً دو گھنٹے چلنے کے بعد ہم سیبوں کے ایک باغ میں چلے گئے۔ باغ کے چوکیدار کی جھونپڑی خالی

★۔ راہِ حق کے مسافروں کے لئے اس طرح کی غیبی امداد تائیدِ ایزدی ہوتی ہے، جو راہِ حق کے متلاشیوں کے قدم قدم پر حوصلے بڑھاتی ہے۔

تھی۔ ہم ایک کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوئے۔ اندر بڑی تعداد میں سیبوں کی خالی پیٹیاں پڑی تھیں۔ یہاں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد گاندربل کی طرف ہم نے سفر جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جس نے ہماری رفتار کم کر دی۔ تقریباً دوپہر کے وقت ہم گاندربل کے مضافات میں نشی باغ تک پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے کچھ دیر قیام کیا۔ یہاں سے سیدھا آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

اب ہمارے سامنے دو متبادل راستے تھے،

ایک یہ کہ ہم پھر پہاڑ پر چڑھائی شروع کریں لیکن خراب موسم کی وجہ سے یہ خطرناک تھا، علاوہ ازیں ہمارے پاس راشن ختم ہو گیا تھا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ ہم کوئی محفوظ پناہ گاہ تلاش کریں۔ جہاں رات تک روپوش رہا جا سکے اگر ممکن ہو تو اس علاقے کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل کی جائیں تا کہ اس پر خطر علاقے کو شب کی تاریکی میں عبور کیا جا سکے۔

میں نے دوسرے متبادل راستے کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری بائیں جانب کچھ فاصلے پر ایک باغ تھا جس میں ایک تین منزلہ مکان تھا۔ میں نے اسی مکان کو چھپنے کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں بائیں جانب کے نالے میں اترتا ہوا باغ تک جا پہنچا اور اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد ہم لوگ ایک اونچی ڈھلان پر چڑھ آئے اور باغ میں داخل ہو گئے۔ میں نے ساتھیوں کو پیچھے رک جانے کا اشارہ کیا اور خود مکان کے آنگن میں پہنچ گیا اور صاحب خانہ کو آواز دی۔

چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی والا ایک ساٹھ سالہ بوڑھا پہلی منزل کی کھڑکی کے پٹ کھول کر سامنے آیا اور کچھ پوچھے بغیر فوراً ہی بول اٹھا "یہ ہمارا رہائشی مکان نہیں ہے۔ ہم وہاں نیچے گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہاں چلے جاؤ، تمہیں کچھ مل جائے گا۔" بوڑھا آدمی ہمیں کوئی پیشہ ور گداگر سمجھا تھا جو دیہاتی علاقے میں عام طور پر پھرتے رہتے ہیں اور "مسافر" کہلاتے ہیں۔ یہ

''مسافر'' خاص طور پر خزاں کے موسم میں گاؤں گاؤں پھرتے ہیں اور صوفی شاعروں کی نظمیں گا کر خیرات طلب کرتے ہیں۔ یہ خیرات عام طور پر نقد کے بجائے جنس میں ہوتی ہے۔ یہ فن اب ایک پیشے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ جس کے ساتھ ایک خاص قسم کا تقدس وابستہ ہو گیا ہے۔ جو عام بھکاریوں کے معاملے میں نہیں پایا جاتا۔ کشمیر میں ایسے افراد کو بھی ''مسافر'' کے نام سے پکارا جاتا ہے جو دوران سفر موسم کی خرابی، راستوں سے ناواقفیت یا کسی اور حادثاتی وجہ سے راہ سے بھٹک گئے ہوں۔ ایسے گم کردہ راہ افراد کی خورونوش سے مدد کرنا اور انہیں پناہ دینا کشمیر کی لوک ریت ہے اور تہذیب کا ایک خاصہ ہے۔ میں نے با آوازِ بلند اس بوڑھے آدمی کو جواب دیا کہ ہم مسافر نہیں ہیں، ہمیں خیرات نہیں چاہیے۔ آپ ذرا نیچے آئیں، آپ سے بات کرنی ہے۔ وہ کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ مجھے ٹالنا چاہتا ہے کہ میں نے دوبارہ کہا، ''آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ جلدی نیچے آیئے، بہت ضروری معاملہ ہے۔''

کچھ پس و پیش کے بعد بوڑھا جس کا نام مجھے بعد میں احمد راتھر معلوم ہوا۔ لوئی لپیٹے ہوئے دروازہ کھولنے کے لئے نیچے آیا۔ میں نے ساتھیوں کو نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ بابا دروازے میں ہی کھڑے کھڑے بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے کہا کہ ہمیں کمرے میں لے چلو اطمینان سے بات کریں گے۔ وہ ہمیں کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں ایک عمر رسیدہ عورت چرخہ کات رہی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ ہم لوگ دھان کی گھاس سے بنی چٹائی پر (جسے کشمیری زبان میں 'پَتَ' جیؔ' کہتے ہیں) بیٹھ گئے۔ میں بوڑھے کے قریب کھسک کر بیٹھ گیا اور بات شروع کی کہ ہم لوگ شکار کے سلسلے میں ادھر پہاڑ پر آئے ہوئے تھے۔ ہم نے آج صبح ہی پہاڑ کو واپسی پر عبور کیا ہے اور اب سری نگر واپس جانا چاہتے ہیں۔ ہم بارش تھم جانے تک تمہارے گھر میں آرام کرنا چاہتے ہیں۔ اتنی دیر میں ہمارے کپڑے بھی سوکھ جائیں گے۔ ہم تمہیں کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتے، ہمیں صرف کانگڑیاں دے دو اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔

بابا نے ایک نوجوان لڑکی سے جو بوڑھی عورت کے قریب کھڑی تھی، کانگڑیاں لانے کو کہا۔

لڑکی تھوڑی دیر میں کانگڑیاں لے کر آ گئی ★۔ بوڑھے آدمی کو ہمارے بارے میں کچھ تجسس تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ ہم کون لوگ ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں ریذیڈنسی روڈ سری نگر میں کاروبار کرتا ہوں۔ اور میری رہائش راج باغ کی آفیسرز کالونی میں ہے ۔(راج باغ سری نگر کی ایک مضافاتی جدید بستی ہے)۔ میں نے بوڑھے کو بتایا کہ میرے دونوں ساتھی میرے ملازم ہیں۔ بوڑھا بظاہر مطمئن ہو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی مجھے کہنے لگا۔'' گاؤں میں ہمارا زمین کی ملکیت کے بارے میں کسی سے مقدمہ چل رہا ہے جو کہ سری نگر کی ایک عدالت میں ہے، کیا آپ اس بارے میں ہماری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟''

'' کیوں نہیں'' میں نے جواب دیا۔'' یہ تو کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ شہر کے تقریباً سارے ہی مجسٹریٹ میرے دوست ہیں، تم مجھے مقدمے کی نوعیت اور مجسٹریٹ کا نام بتاؤ میں تمہاری مدد کروں گا۔''

بابا بہت خوش ہوا اور کہنے لگا'' میں ابھی حبیب کو بلاتا ہوں وہ آپ کو سب کچھ بتا دے گا''۔

حبیب راتھر اس کے بیٹے کا نام تھا اور وہی مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ بوڑھے نے ہم سے پوچھا '' کیا آپ روزے سے ہیں؟'' میں نے جواب دیا'' چونکہ ہم سفر میں ہیں اس لئے روزہ نہیں رکھا۔'' بوڑھے نے ہم سے پوچھا'' کیا آپ ٹیوٹھ پینا پسند کریں گے؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ بوڑھے نے لڑکی سے کہا کہ ساوار میں ٹیوٹھ (نمکین قہوہ) گرم کرے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے گرم گرم ٹیوٹھ کے پیالے پیے۔

دریں اثنا بارش تھم چکی تھی، میں نے بوڑھے سے پوچھا،'' گاندربل سے سری نگر جانے والی بسوں کے اوقات کیا ہیں؟'' بابا نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا کہ ٹرانسپورٹ کا یہاں کوئی مسئلہ نہیں، ہمیں کسی بھی وقت گاڑی مل سکتی ہے۔ لیکن اُس نے خواہش ظاہر کی کہ ہم اُس کے بیٹے کے آنے تک انتظار کریں تا کہ ہمیں اُن کے مقدمے کی تفصیل معلوم ہو سکے۔ میں نے اُس کے بیٹے کی واپسی تک رُک جانے کی حامی بھر لی اور اُس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اُس سے بسوں

★۔ بوڑھے کی بیٹی نے گرم گرم کوئلوں سے بھری ہوئی تین کانگڑیاں لا کر دیں۔

کی آمد و رفت کے بارے میں پھر سوال کیا۔ بوڑھا اب ہم سے کچھ مانوس ہو گیا تھا۔ کچھ محتاط لہجے میں کہنے لگا "سری نگر کا سفر اِن دنوں مصیبت بن گیا ہے، فوج اور سی آر پی والوں نے جگہ جگہ چوکیاں قائم کر رکھی ہیں۔ ہر آنے جانے والے کی تلاشی لے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ برقع پوش خواتین کو بھی نہیں چھوڑتے۔"

میں نے بات کاٹ کر پوچھا "ابھی ایک ہفتہ پہلے جب ہم اُس طرف سے آئے تھے تب تو کوئی چیکنگ نہ تھی۔ اب یہ لوگ عوام کو کیوں پریشان کر رہے ہیں۔"

میرے سوال پر بابا نے حیران ہو کر پوچھا "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تین کشمیری مجاہد سنٹرل جیل سے بھاگ گئے ہیں؟" میں نے جواب دیا "ہمیں تو کچھ معلوم نہیں، ہمیں دراصل سری نگر سے نکلے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔" میں نے حیرانگی اور دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اُن مجاہدوں کے بارے میں بوڑھے سے سوالات پوچھے۔

بوڑھا سنجیدگی سے بولا "یہ مجاہد بہت عرصے سے جیل میں قید تھے اور اُن میں سے کچھ کو موت کی سزا ہو چکی تھی۔ انہوں نے جیل میں ایک سرنگ نکالی اور بھاگ گئے۔ میرا بیٹا حبیب راتھر ابھی کل ہی سری نگر سے ہو کر آیا ہے، وہی یہ خبر لایا ہے★۔ اسلئے فوجیوں کے علاوہ سی آئی ڈی والے بھی ان کی تلاش میں ہیں لیکن ابھی تک اُن کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

"بڑی عجیب بات ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ "لیکن اگر یہ صحیح ہے تو وہ بہادر لوگ بڑے قابلِ تعریف ہیں"۔ اسکے بعد ہم 1965ء کے مجاہدوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے یوں ظاہر کیا کہ 1965ء میں مجاہدوں کی میں نے بڑی مدد کی تھی۔ بوڑھا بڑا متاثر ہوا۔ میں نے کہا۔ "1965ء میں بھی کچھ مجاہد (کمانڈو) اس علاقے میں کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔"

★ حبیب راتھر سری نگر سے روزنامہ "آفتاب" لے کر آیا تھا۔ جس میں مقبول بٹ اور اُن کے ساتھیوں کے فرار کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔

واقعہ یہی تھا★۔

بابا نے ٹھنڈا سانس لیا اور جواب دیا" ہاں سنا ہے، کچھ مجاہد اس علاقے میں بھی کارروائیاں کرتے رہے ہیں اور کچھ لوگ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ انہوں نے خود ان کو دیکھا ہے، لیکن میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ کاش میں نے ان میں سے کسی کا دیدار کیا ہوتا۔"

میں نے موضوع تبدیل کیا اور بوڑھے سے اس کی زندگی کے بارے میں سوال کرنے لگا۔ بوڑھا متوسط طبقے کا ایک کسان تھا اور اپنی جوانی کے دنوں میں ایک پیشہ ور "مُرکبان" تھا۔ کشمیری زبان میں مرکبان ایسے اشخاص کو کہا جاتا ہے۔ جنہوں نے باربرداری کے لئے گھوڑے اور خچر پالے ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے وہ دیہاتی علاقے میں لوگوں کا سامان اِدھر اُدھر پہنچاتے ہیں۔ بوڑھا مجھے سری نگر سے گریز، استور، بونجی اور گلگت تک اپنی باربرداری کی مہمات کی کہانیاں سناتا رہا۔ اس نے بڑے تاسف سے کہا کہ یہ سب گئے دنوں کی باتیں ہیں ۔ اب تو بونڈری (سیز فائر لائن) نے ہمارے ملک کو دو حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ اب نہ ہم اِدھر سے اُدھر جا سکتے ہیں۔ نہ اُدھر سے اِدھر آسکتے ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹے کی گفتگو کے دوران میں نے بوڑھے کو پرکھ لیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ علیحدگی میں اس سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں ۔ معاملہ بہت اہم ہے ۔ بابا رضامند ہوگیا اور میں اس کو مکان کی تیسری منزل میں ایک کمرے میں لے گیا۔ ہم ایک چٹائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا وہ باوضو ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے جیب سے پنج سورہ نکالا اور اسے کھولا۔ بوڑھا پڑھ نہیں سکتا تھا لیکن اس نے پہچان لیا کہ یہ قرآن شریف ہے۔ میں نے کہا" بابا قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ میں جو کچھ تم سے کہنے لگا ہوں کسی پر ظاہر نہیں کرو گے۔"

★۔ 1965ء کو پاکستان نے خفیہ طور پر" آپریشن جبرالٹر "کے نام سے ہزارہا مسلح رضاکار بھارتی مقبوضہ کشمیر میں داخل کئے تھے۔ یہی کارروائی 6 ستمبر 1965ء کی جنگ کا سبب بنی جس میں پاکستان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ آپریشن جبرالٹر بری طرح ناکام ہوا۔

بُوڑھے نے بِلا حیل و حجت قسم کھائی۔ میں نے بوڑھے کو بتایا"کہ جیل سے فرار ہونے والے مجاہد ہم ہی ہیں"۔ یہ سُنتے ہی اس کے چہرے پر اچانک ایک چمک آئی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے رُخسار سرخ ہو گئے ہیں۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں نے اُس کے چہرے پر کیا تاثر دیکھا۔ اُس کے وجود میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔ خوشی کے آنسو اُس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔ اُس نے میرے ہاتھوں کو چوما اور مجھے گلے لگا لیا۔ اب ہم اس کے انتہائی معزز مہمان تھے۔ اُس نے کھڑے ہوئے کر مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا اور تقریباً دوڑتا ہوا نیچے جا پہنچا۔ نیچے والی منزل میں پہنچ کر وہ ایک اور کمرے میں داخل ہوا۔ چٹائی بچھائی، الماری میں سے صاف ستھرے نئے بستر نکال کر بچھائے اور مجھ سے کہنے لگا۔"اپنے ساتھیوں کو اس کمرے میں لے آؤ۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ بوڑھا بڑا پُر جوش تھا۔ اُس نے اپنی بیوی سے بات کی۔ فوراً ایک مرغ ذبح کر کے ہماری دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ بغیر دودھ کے نمک والی کڑوی چائے کے بجائے سماوار میں قہوہ تیار ہونے لگا★۔ بوڑھی خاتون بھی بہت مسرور تھی۔ لڑکی کو گاؤں جا کر بابا کے بڑے بیٹے حبیب کو بلانے کو کہا گیا۔ حبیب آیا تو اُس کا مجھ سے تعارف کروایا گیا۔ حبیب کو بھیج کر نیچے سے کھانا اوپر ہی منگوا لیا گیا۔ بابا نے حبیب کو تاکید کی کہ اور کوئی اوپر نہ آئے۔ اس رات کا کھانا بوڑھی خاتون نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا۔ مجاہدوں کے لئے کھانا پکاتے ہوئے اُسے بڑا فخر محسوس ہوا۔ رات کے کھانے پر صرف حبیب اور اس کے چھوٹے بھائی کو ساتھ بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ عورتوں کو اِس طرف آنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ کچھ دیر قبل کے اجنبی مُسافر چشم زَدَن میں اہم شخصیات کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ہمیں آرام پہنچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی گئی۔ شام کو بڑا پُر تکلف کھانا کھلایا گیا۔ وقفے وقفے سے چائے اور قہوہ پیش کیا جاتا رہا۔ بابا اور اس کے دونوں بیٹے دیر تک ہم سے گپ شپ کرتے رہے۔ آخر میں نے اُن سے کہا کہ آج رات کسی وقت

★۔ سماوار ایک مخصوص قسم کا تانبے یا پیتل کا بنا ہوا کیتلی نما برتن ہوتا ہے جس میں کشمیری لوگ چائے یا قہوہ تیار کرتے ہیں۔

ہمیں اپنی کسی نئی منزل کے لئے روانہ ہونا چاہیے۔حبیب نے پیش کش کی کہ وہ اس غیر محفوظ علاقے سے پار کسی بھی مقام تک ہمارے ساتھ جانے کے لئے تیار ہے۔اس کے بعد ہم آرام کی نیند سو گئے۔

12 دسمبر 1968ء۔تقریباً ایک بجے شب ہماری آنکھ کھلی۔بوڑھا بابا پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا۔اس نے اپنے بیٹے کو بستر سے نکالا۔ہمارے لئے تازہ کھانا تیار کیا گیا۔بابا ہمارے لئے کچھ سیب لے کر آیا۔ایک ''ترُکھ'' چاول۔(ایک ترُکھ تقریباً 6 سیر ہوتا ہے)اور کچھ پکی ہوئی روٹیاں ساتھ لے جانے کے لئے ہمیں دی گئیں۔ہم نے کچھ پس و پیش کے بعد یہ تحائف قبول کئے۔چاند کی مدہم روشنی میں ہم اس کے گھر سے روانہ ہوئے۔بابا نے بوجھل دل کے ساتھ ہمیں الوداع کیا اور دعائیں دیں۔حبیب بطور رہبر ہمارے ساتھ چل پڑا۔اس کی مدد سے سکیورٹی کے گھیرے کو ہم نے نہایت آسانی کے ساتھ عبور کر لیا۔دھان کے کھیت بارش کے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔تاہم ہم انہیں عبور کرتے رہے۔بڑی سڑک اور سندھ نالہ کو پار کر کے ہم پُل سے شمال کی جانب کافی دور نکل گئے۔تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد حبیب نے ہمیں ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جو ہماری تجویز کردہ اگلی منزل تک جاتا تھا۔

شفیق بابا کے گھر سے روانگی سے قبل میں نے محاذِ رائے شماری کے ایک لیڈر شیخ نذیر احمد (جو کہ شیخ عبداللہ کے بھتیجے ہیں) کے نام ایک خط لکھ کر چھوڑا۔جس میں جیل سے فرار میں اپنی کامیابی اور اب تک کے سفرِ بخیر کی روئیداد بیان کی۔خط میں، میں نے یہ بھی گزارش کی کہ وہ حبیب راتھر کی اُس کے سری نگر والے زمین کے مقدمے میں حتی الامکان مدد کریں۔شیخ نذیر سے میری ملاقات ایک ساتھی کے ذریعے سری نگر جیل میں ہوئی تھی، جہاں اتفاق سے وہ بھی اُن دنوں محبوس تھے۔

سندھ نالے کو عبور کرنے کے بعد ہمارا رُخ شمال مشرق میں ایک گھنے جنگل کی طرف تھا ،تاہم تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لارنہر پر پہنچ گئے۔یہ ہمارے لئے ایک غیبی امداد ثابت

ہوئی۔ہم نے اپنی سمت تبدیل کی اور نہر کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ کچھ دیر بعد ہم ایک گاؤں میں پہنچے جس کا نام اب مجھے یاد نہیں رہا۔نہر گاؤں کے بیچوں بیچ گزر کر اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔گاؤں کے وسط میں نہر کے قریب ہی ہمیں ایک مسجد نظر آئی۔ہم آگے بڑھے اور مسجد کے حمام میں داخل ہوگئے۔(کشمیر میں عام طور پر مسجدوں کیساتھ گرم حمام کا انتظام ہوتا ہے)۔ ہم نے حمام میں غسل کیا اور نفل ادا کئے۔اس دوران گاؤں کے لوگ مسجد میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور وہاں سے چل پڑے۔جنگلات کے سلسلے کو اپنے دائیں ہاتھ رکھتے ہوئے ہم نہر کے کنارے کنارے آگے بڑھتے رہے۔کچھ دیر کے بعد ہم ایک "رَکھ" میں پہنچ گئے ۔جو کہ موضع بَارسُو کے قرب و جوار میں تھی۔رَکھ کے بیچ میں سے گزر کر ایک مقام سری نگر، بانڈی پورہ روڈ پر پہنچ گئے۔یہاں سے ہم نے سیدھا بانڈی پورہ کی طرف پیش قدمی شروع کی اور سُنبل، گاندربل روڈ اور بانڈی پورہ سری نگر روڈ کے سنگھم پر آ گئے۔ہم سُنبل روڈ پر چل پڑے۔ پَو پھٹنے لگی تھی۔کچھ مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم بَارسُو گاؤں میں پہنچ گئے۔گاؤں کے آخری سرے پر ایک بغلی گلی سے ایک شخص نمودار ہوا۔ہمیں دیکھتے ہی اس نے ہمیں سلام کیا۔میں نے سلام کا جواب دیا۔وہ سحری کے بعد مسجد کی طرف فجر کی نماز کے لئے جا رہا تھا۔اُس نے پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے اُسے بتایا کہ میں قریبی علاقے کا تحصیل کا فارسٹر ہوں اور ہم سُنبل جا رہے ہیں (سُنبل اس علاقے کا صدر مقام ہے) کشمیر میں دیہاتی لوگوں کے لئے محکمہ جنگلات اور محکمہ مال سے تعلق رکھنے والے سرکاری ملازم ایک کمزوری کی حیثیت رکھتے ہیں اور لوگ اُن سے خواہ مخواہ تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔میرے ملاقاتی کا نام محمد اَخونؔ تھا۔اس نے نیا نیا مکان بنایا تھا اور اُسے عمارتی لکڑی کی اشد ضرورت تھی۔اُس نے پیش کش کی کے ہم اس کے گھر جا کر چائے کی پیالی پئیں۔اور کچھ دیر آرام کریں۔چونکہ دن چڑھنے والا تھا۔اور ہمیں یوں بھی کسی پناہ گاہ کی ضرورت تھی۔ہم نے بلا حیل و حجت محمد اَخونؔ کی پیش کش قبول کر لی۔

وہ ہمیں اپنے ساتھ لے چلا، گلی میں چند قدم چلنے کے بعد ہی ہم اپنے میزبان کے

زیرِ تعمیر مکان میں پہنچ گئے۔ کیونکہ تعمیر ابھی مکمل نہ ہوئی تھی اس لئے ابھی تک وہ اس میں منتقل نہ ہوئے تھے۔ محمد اَخُونؒ کا پرانا رہائشی مکان چند سو گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ اَخُونؒ نے ہمیں اپنا گھر دکھایا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اِسی میں ٹھہرایا جائے۔ یہاں سے سارا گاؤں اور سڑک صاف نظر آتی تھی۔ وہ ہمیں دوسری منزل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ ہمیں کمرے میں چھوڑ کر اَخُونؒ اپنے گھر چلا گیا۔ تقریباً نصف گھنٹہ بعد نمکین چائے سے بھرا ہوا سماوار اور چاول کے آٹے کی روٹیاں لے کر واپس آیا۔ میں نے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ اپنا سامان وغیرہ نہ کھولیں۔ اور چلنے کے لئے تیار رہیں۔ ہم نے اپنے جوتے تک نہ اتارے۔ اگرچہ یہ یہاں کے رواج کے مطابق بڑی نازیبا حرکت تھی۔ میں خود کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا تاکہ باہر نظر رکھ سکوں۔

جب اَخُونؒ واپس آیا تو ہمارے اس روّیے پر کچھ متعجب ہوا، لیکن اُس نے اِس کا اِظہار نہ کیا۔ میں نے چائے پیتے ہوئے بھی اپنے جوتے نہ کھولے۔ آخر اَخُونؒ سے نہ رہا گیا اور مُجھ سے پوچھنے لگا کہ میں آرام سے کیوں نہیں بیٹھتا۔ اور جوتے کیوں نہیں اتارتا؟ میں نے اُسے یہ کہہ کو خاموش کر دیا کہ ہم سے غیر ضروری سوالات نہ کرے۔ کیونکہ ہم تھوڑی دیر میں ہی یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ اَخُونؒ نے اس بات کو کچھ محسوس کیا اور بولا۔ "میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ یہ کہہ رہا تھا کہ آپ میرے گھر میں مہمان ہیں، آرام سے بیٹھیں۔ ورنہ جیسے آپ کی مرضی۔"

میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ سامان کھول دیں اور جوتے اتار کر آرام سے لیٹ جائیں۔ میں اپنے جوتے اتارتے ہوئے اَخُونؒ سے مخاطب ہوا۔ "اگر تمہیں ہماری خدمت کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو ہمیں تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اور تمہاری خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔"

اَخُونؒ بڑا خوش ہوا۔ اور ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے اُس کے خاندان کے بارے میں پوچھا۔ اُس کے خاندان میں اُس کی بیوی کے علاوہ اُس کی ایک جوان بیٹی تھی۔ جس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ مکان کی تعمیر کے لئے اُسے کچھ لکڑی دِلا

دوں گا۔ اب دن نکل آیا تھا۔ میں نے اُخونؒ سے کہا کہ اب ہم گاؤں میں کسی بس کی آمد کا انتظار کریں گے اور یہاں سے سُنبل تک کسی بس میں جائیں گے۔ میری نظر ایک سلائی کی مشین پر پڑی۔ پتا چلا کے محمد اخون فالتو وقت میں درزی کا کام کرتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک کاشتکار تھا۔ میں نے اس سے سلائی کی مشین اور قینچی طلب کی۔ قینچی سے میں نے اپنے جیل کے ایک کمبل سے دستانہ کاٹا اور مشین پر اس کی سلائی کر ڈالی۔ اخون سے دوران گفتگو میں نے معلومات حاصل کیں۔ گاندربل کے بابا احمد راتھر سے جو معلومات مجھے حاصل ہوئی تھیں، محمد اخون سے اس کے علاوہ اس علاقے میں موجود سکیورٹی کی چوکیوں اور گشتی دستوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ جو کہ اُس علاقے میں مفرور مجاہدوں کی تلاش میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہر طرف انہی کا چرچا تھا۔

میں نے محمد اُخونؒ کا رویہ کچھ ہمدردانہ پایا، اور مجاہدوں کے بارے میں اس کے جذبات کا اندازہ کر لیا تو میں نے اپنے مخصوص طریق سے قرآنِ پاک پر اُس سے حلف لیا اور اُس پر اصل حقیقت کھول دی۔ محمد اُخونؒ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اپنے گھر جا کر ہمارے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اُسے روک دیا اور کہا کہ اب اُسے ہمارے ساتھ یہیں رک جانا چاہیے۔ اس نے بڑی نیک نیتی سے چاہا کہ وہ گھر جا کر ہمارے لئے اچھا سا کھانا تیار کروائے۔ لیکن میں نے اُسے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب چونکہ اس پر ہماری اصل حقیقت آشکار ہو چکی ہے اس لیے وہ اس گھر سے باہر نہیں جا سکتا۔ میں نے اُس سے کہا کہ یہ ہمارا اصول ہے اور اِس بات پر تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔ تم نے جو چائے پلائی ہے ہمارے لئے وہی کافی ہے۔ اُخونؒ مطمئن ہو گیا اور سارا دن ہمارے ساتھ رُکا رہا۔

اُس کا نوجوان داماد صبح کو ہم سے ملنے آیا۔ اُخونؒ نے اُسے گھر جا کر ہمارے لیے کھانا وغیرہ پکوانے کے لیے کہا۔ اُس نے اپنے داماد کو یہ بھی بتایا کہ وہ سارا دن مہمانوں کے ساتھ ہی رہے گا، اِس لیے وہ گھر کا خیال رکھے۔ دن بھر ہم اُس سے گپ شپ کرتے رہے اور باری باری آرام کرتے رہے۔ اُخونؒ نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں کم سے کم اس کی بیٹی کو جو کہ اُس کی اکلوتی

اولاد ہے، کو اپنا یعنی مجاہدوں کا دیدار کرنے کی اجازت دوں۔ پہلے تو میں نے ٹالا لیکن جب اس نے بہت زور دیا تو مجھے ماننا پڑا۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ وہ افطاری کے وقت کھانا لے کر آئے گی اور ہمیں دیکھے گی۔

میری فرمائش پر اَخونؔ اس بات پر بھی رضا مند ہو گیا کہ وہ سنبل تک راہنمائی کے لئے ہمارے ساتھ کوئی گائیڈ بھیجے گا۔ مجوزہ گائیڈ ایک پچیس سالہ نوجوان تھا جو اَخونؔ کا با اعتماد رشتہ دار تھا اور گاؤں میں دکانداری کرتا تھا۔ افطاری سے کچھ دیر قبل اَخونؔ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ اپنی بیٹی اور داماد کے ہمراہ کھانا لے کر واپس آ گیا۔ ہم نے کھانا کھا کر انہیں رخصت کیا۔ میاں بیوی ہمیں دیکھ کر انتہائی مسرور تھے۔ وہ اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے ہمارے لئے کچھ فروٹ بھی لیکر آئے تھے۔ شام کے وقت اَخونؔ گائیڈ کو ہمراہ لے آیا۔ گائیڈ ہم سب سے بغلگیر ہوا۔ اُسے اس بات کی بہت خوشی تھی کہ وہ ہمارے کسی کام آنے لگا ہے۔ وہ اپنے ساتھ کچھ سبز چائے، کھانڈ، سگریٹ اور کلیچے بھی لایا تھا تا کہ سفر میں کام آ سکیں۔ شام کے سات بجے رات کی تاریکی میں ہم اَخونؔ کے گھر سے گائیڈ کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ اَخونؔ نے گائیڈ کو راستے کے بارے میں کچھ ہدایات دیں۔

ہم سُنبل کی سمت سڑک پر کچھ دیر چلتے رہے۔ اس کے بعد سڑک چھوڑ کر مکئی اور دھان کے کھیتوں میں چلنا شروع کیا۔ تاریکی کے باوجود ہم بجلی کے قمقموں کی وجہ سے مختلف گاؤں کی پہچان کر سکتے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد میں نے اپنے گائیڈ کو واپس بھیج دیا۔ اُس نے سُنبل تک ہمارا ساتھ دینے پر اصرار کیا۔ لیکن چونکہ سُنبل کا قصبہ اب صاف نظر آ رہا تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ جانے کی ضرورت نہ تھی۔ علاوہ ازیں رات کو دیر تک غیر حاضر رہنے کی وجہ سے ہو سکتا تھا کہ اس کے گھر والوں کو پریشانی ہوتی۔ بادلِ نخواستہ وہ واپس لوٹا۔ چند منٹ بعد ہم نے اپنی سمت تبدیل کر لی۔ دراصل ہمارا سُنبل جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ یہاں سے ہم نے مغربی سمت کو سری نگر باندی پورہ روڈ کے متوازی کھیتوں کے بیچوں بیچ پیش قدمی شروع کی۔ ہم گھنٹوں چلتے رہے

اور مختلف دیہاتوں کی روشنی سے اس بات کا اندازہ کرتے رہے کے ہم سُنبل سے کافی دور نکل آئے ہیں بغیر رُکے چلتے رہے، نصف شب کے قریب ہم مانس بَل جھیل★9 کے قریب پہنچے۔ دراصل یہ علاقہ دلدلوں اور چھوٹی چھوٹی جھیلوں پر مشتمل تھا اور مرغابیوں کے شکاریوں کے لئے جنت ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک جھیل کے پشتوں میں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈتے رہے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ہماری بائیں جانب ایک خاصہ بڑا گاؤں نظر آ رہا تھا۔ جیسا کہ دور تک پھیلی ہوئی بجلی کی روشنیوں سے ظاہر ہوتا تھا۔ جب ہم جھیل کو عبور کرنے میں ناکام رہے تو ہم نے گاؤں کے اندر جا کر کوئی رہبر تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ہم نے آبادی سے ذرا الگ تھلگ واقع دو گھروں کا انتخاب کیا۔ لیکن بدقسمتی سے دونوں گھر غیر آباد تھے۔ کچھ دیر رُک کر ہم سوچتے رہے کہ کیا کیا جائے۔ اِسی دوران اچانک برقی رو کے فیل ہو جانے کی وجہ سے سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اب اِس کے سوا کوئی چارا نہ تھا کہ گاؤں کے اندر جا کر کوئی گائیڈ تلاش کیا جائے۔

ہم احتیاط سے گاؤں میں داخل ہو گئے اور کتوں سے بچتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ کسی گھر کے باہر سے آواز دینا بھی خطرناک تھا۔ کیونکہ اس طرح سارے محلے میں شور مچ جانے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔ تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ کس گھر میں لوگ جاگ رہے ہیں۔ ہم ابھی پہلی گلی میں ہی جا رہے تھے کہ ہم نے ایک کٹھار کی دوسری منزل میں کسی کی کھانسی کی آواز سُنی۔ (کٹھار کچی لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا گودام ہوتا ہے۔ جس میں کسان سال بھر کا غلہ جمع رکھتے ہیں۔ بعض خوش حال کسان کٹھار کے اوپر مہمانوں کے استعمال کے لئے ایک کمرہ بھی بنا لیتے ہیں۔ کٹھار رہائشی مکان کے قریب ہی بنایا جاتا ہے اور دونوں کا آنگن ایک ہی ہوتا ہے۔) میں نے ساتھیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا اور چھڑی سے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کو کھٹکھٹایا۔ پہلی بار کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن دوسری بار کھٹکھٹانے پر اندر سے آواز

9★۔ **مانس بل** جھیل سری نگر سے 27 میل کے فاصلے پر صفاپور میں واقع ہے۔ اس جھیل میں کنول کے پھول بکثرت پیدا ہوتے ہیں نیز مچھلی بھی پیدا ہوتی ہے۔

آئی کون ہو؟ اور اس وقت رات گئے کیا چاہتے ہو؟ شاید وہ ہمیں کوئی غیر پسندیدہ لوگ سمجھ بیٹھا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔" بھلے آدمی ہم کوئی چور نہیں۔ ذرا کھڑکی کھولو اور ہم سے بات کرو۔" اُس نے کھڑکی کھولی اور ہم سے پوچھا کیا چاہیے؟ میں نے جواب میں نہایت نرمی سے کہا، "ہم مسافر ہیں، سنبل سے آئے ہیں، آگے ایک گاؤں میں جانا ہے، تھکے ہوئے ہیں، کچھ دیر آرام کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا اور بولا "وہ گاؤں کی مسجد ہے۔ جاؤ اور جتنی دیر چاہو آرام کرو۔" میں نے کہا، "دوست بات یہ ہے کہ ہم مسجد میں جا کر آرام نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو ہم اتنی دیر گئے تمہیں تکلیف نہ دیتے۔ یا تم نیچے آ کر ہم سے مل لو یا ہمیں اُوپر آ کر بات کرنے دو۔"

وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اُس نے کچھ توقف کے بعد صحن کی ڈیوڑھی اور کٹھار کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ ہم صحن میں داخل ہوئے اور وہاں لکڑی کی سیڑھیوں پر چڑھ کر کٹھار کے اوپر پہنچ گئے۔ نوجوان نے دروازہ کھول کر ہمیں اندر بلا لیا۔ اُس نے لیمپ روشن کر کے غور سے ہمیں دیکھا۔ اُس کے چہرے پر اچانک مسرت کی چمک پیدا ہوئی اور بولا "اچھا! تو یہ آپ لوگ ہیں۔ مجھے آپ کے آنے کی بہت خوشی ہوئی۔ میری سمجھ میں اب یہ بات آئی ہے کہ آپ مسجد میں کیوں نہیں جانا چاہتے تھے۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ ہی وہ مجاہد ہیں جو جیل سے بھاگے ہیں۔"

میں نے اُس کی بات کاٹی۔" ہم تمہاری اِس خوش خلقی کے بہت شکر گزار ہیں۔ ہم تمہیں کوئی تکلیف نہ دیتے لیکن ہم ایک ایسی مشکل میں پھنس گئے ہیں جو تمہاری مدد کے بغیر حل نہیں ہو سکتی۔ ہم یہاں سے جھیل کے اُس پار جانا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہماری مدد کر سکتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا" کیوں نہیں یہ تو بڑی معمولی بات ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لئے کچھ اور بھی کر سکتا ہوں۔" اُس کا لہجہ بہت پُر جوش تھا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔" جناب ہم مجاہدوں کے لئے کوئی بھی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن آپ ذرا بیٹھ کر آرام تو کریں۔"

نوجوان کے کہنے پر ہم بیٹھ گئے، اُس نے روشنی گُل کر دی لیکن ہم سے گفتگو جاری رکھی۔ مجاہدوں اور اُن کی تحریک کے بارے میں بات چیت کرتا رہا۔ اُس نے ہمیں اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں بتایا۔ جو کسی کالج میں زیرِ تعلیم تھا اور جسے ہم سے ملنے کا بہت شوق تھا۔

میں نے اُس سے کہا وہ تیار ہو جائے کیوں کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے لیکن وہ نہ مانا اور کہنے لگا، ''میں آپ کو ایسے کس طرح جانے دوں، آپکو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ سحری قریب ہے۔ آپ سحری میرے ساتھ کھائیں گے، پھر میں آپ کے ساتھ چلا چلوں گا۔''

مجھے اُس کی بات ماننا ہی پڑی۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد وہ اُٹھا اور ہمیں اپنے رہائشی مکان میں لے گیا۔ وہاں اُس نے ہمارا تعارف اپنے بھائی سے کروایا۔ اُس کا بھائی بھی ہم سے مل کر بہت خوش ہوا۔ ہم نے گرم پانی سے ہاتھ منہ دھویا۔ سحری میں ہمیں ٹھنڈے چاول اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا سالن کھلایا گیا۔ (چھوٹی مچھلیوں کو کشمیری زبان میں ''گُرنْ'' کہتے ہیں) سحری کے بعد ہم نے سری نگر ریڈیو سے سحری کا پروگرام بھی سنا۔ اس کے بعد وہ دونوں بھائی ہمارے ساتھ چل پڑے اور ہمیں جھیل کے اُس پار پہنچا دیا۔ وہ ہمارے ساتھ سُنبل بانڈی پورہ روڈ تک آئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہاں سے ہم بانڈی پورہ چلے جائیں گے۔ وہ اِس سے آگے بھی ہمارا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ لیکن میرے اصرار پر واپس چلے گئے۔ مجھے ان دونوں بھائیوں کے نام اب یاد نہیں رہے۔ لیکن **وَگے** خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

13 دسمبر 1968ء تقریباً دو گھنٹے تک ہم ناک کی سیدھ میں چلتے رہے۔ یہاں تک کہ موضع سِنْدَرہ کوٹ پہنچ گئے۔ اس گاؤں کے لوگ کشمیر کی افسانوی تاریخ میں سادہ لوحی اور کم فہمی کے لئے مشہور ہیں۔ سویرا ہو چکا تھا، مسجدوں میں سے لوگوں کے درُود و سلام اور وظیفہ خوانی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ عورتوں کی قطاریں سروں پر گھڑے اُٹھائے ندیوں اور شفاف چشموں سے پانی بھرنے کے لئے آ جا رہی تھیں۔ ہم سِنْدرہ کوٹ میں سے تیزی سے نکل گئے اور دن کے قیام کے لئے کسی پناہ گاہ کی تلاش کرنے لگے۔ ابھی اس تلاش میں ہی تھے کہ سورج طلوع ہوا۔

سِنڈرہ کوٹ سے میل بھر آگے ہمیں تین گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی نظر آئی ۔ ویسی جگہ تکیہ کہلاتی ہیں ۔ یہ جگہ بانڈی پُورہ روڈ کے شمال میں ایک بے آب و گیاہ ٹیلے کے دامن میں واقع تھی ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں یا تو اس بستی میں اپنی پناہ گاہ تلاش کرنی چاہیے یا اس ٹیلے پر کوئی جگہ ڈھونڈنی چاہیے۔

ہم ایک نالے کے بیچ میں سے گزر کر بستی کے آخری مکان تک پہنچے اور صحن میں داخل ہو کر گھر والوں کو آواز دی ۔ایک نو جوان عمر کا لڑکا باہر آیا۔ میں نے باقی گھر والوں کے بارے میں استفسار کیا۔لڑکے نے جواب دیا۔''ابا ابھی مسجد سے نہیں آئے ۔بس آتے ہی ہوں گے۔'' میں نے کہا،''ہم تمہارے مہمان ہیں تمہارے ابّا سے ملنا چاہتے ہیں اور کچھ دیر تمہارے گھر میں ٹھہرنا چاہتے ہیں''۔لڑکا بلا تامّل ہمیں گھر کے اندر لے گیا۔ میں نے لڑکے سے اُس کا نام اور اُس کے باقی گھر والوں کے بارے میں پوچھا۔لڑکے کا نام غلام رسول تھا اور وہ طالبعلم تھا۔ پندرہ ایک منٹ بعد لڑکے کا باپ جس کی عمر چالیس پینتالیس برس تھی، مسجد سے واپس آیا۔اس کے آتے ہی لڑکے نے عجیب وغریب مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی۔

وہ کمرے میں آیا۔ عَلیک سُلیک کے بعد میرے قریب بیٹھ گیا اور پوچھا،'' آپ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں''؟ میں نے اُسے بتایا کہ ہم شکاری ہیں اور اس پہاڑی کی دوسری طرف شکار پر جا رہے ہیں ۔ہم اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہے ہیں جو بندوقیں لے کر پیچھے آ رہے ہیں ۔میرے جواب سے وہ مطمئن ہو گیا اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے ۔اِس دوران ہم سب نے شیو بنائی ۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں سکول ماسٹر ہوں ۔ یہ سُن کر اُس نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اُس کے بیٹے کا امتحان لوں ۔ بیچارہ خود اَن پڑھ تھا لیکن اپنے بیٹے کو بڑے شوق سے تعلیم دلا رہا تھا۔ میں نے لڑکے کو قریب بلایا اور اس سے کچھ سوالات کیے ۔لڑکا نویں جماعت کا طالبعلم تھا۔قریباً گھنٹہ بھر تک اس کا امتحان لینے کے بعد میں نے اُس کے باپ کو بتایا کہ لڑکا پڑھائی میں کمزور نہیں ہے ۔اور اِنشاءَاللہ امتحان میں کامیاب ہو جائے گا ۔اب اُس نے مجھ سے ایک اور

فرمائش کر ڈالی کہ میں اُس کی دس سالہ بیٹی کا بھی امتحان لوں جو ایک مکتب کی طالبہ تھی۔ بچی قرآن شریف لے کر آئی اور مخصوص کشمیری لہجے میں تلاوت شروع کی۔ وہ پڑھائی میں کچھ کمزور تھی اور مجھے بار بار اس کی غلطیوں کی اصلاح کرنی پڑتی تھی۔ میری تلاوت پر دہقان کو کچھا چنبھا ہوا۔ اُس نے اچانک مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ''آپ نے یہ قرأت کہاں سے سیکھی ہے''؟ میں اُس کے سوال میں پنہاں اشارے کو سمجھ تو گیا لیکن میں نے اُس سے سوال کیا، ''تمہیں اِس سے کیا دلچسپی ہے؟''

''آپ کی تلاوت نے مجھے پرانے دنوں کی یاد دلائی ہے، جب تقسیم سے پہلے میں نوجوان تھا اور محنت مزدوری کے لئے پنجاب جایا کرتا تھا۔ اُس نے کہا وہاں کے مولویوں کو میں نے اِسی انداز سے قرآنِ شریف کی تلاوت کرتے سنا تھا''۔

میں نے بتایا کہ میں نے مذہبی تعلیم پنجاب میں ہی حاصل کی ہے۔ میں اُس کے ماضی کے بارے میں سوال کرنے لگا۔ وہ مسرّت آمیز لہجے میں پنجاب میں اپنے قیام کے دوران کے تجربات بیان کرتا رہا اور اس طرح ہماری گفتگو بڑھتے بڑھتے سیاسی معاملات اور آخر کار کشمیر کے اندر مجاہدوں کی سرگرمیوں تک پہنچ گئی۔ اپنے میزبان کی جانچ پرکھ کر لینے کے بعد میں نے اپنی حقیقت اس پر ظاہر کر دی۔ اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور ہماری ٹہل سیوا میں وہ جو کچھ بھی کر سکتا تھا، کرنے لگا۔ میرے ساتھیوں میں سے باری باری ایک ایک آدمی پہرہ دیتا رہا۔ اپنے میزبان سے ہمیں معلوم ہوا کہ بانڈی پورہ کے علاقے میں زبردست ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ اور ہماری گرفتاری کے لئے ہر طرف چھاپے مارے جا رہے ہیں۔

یہ اطلاعات اتنی پریشان کُن تھیں کہ ہمیں بانڈی پورہ کی طرف جانا بہت ہی پُرخطر نظر آیا۔ میں نے اپنا راستہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کے وقت میں نے اپنے میزبان سے کسی ایسے گائیڈ کا بندوبست کرنے کے لئے کہا جو ہمیں دریائے جہلم پر کسی ایسے مقام تک راہنمائی کر سکے جہاں سے ہم دریا پار کر کے سوناواری تحصیل کے علاقے میں داخل ہو سکیں۔ اُس نے اپنے بیٹے کے ذریعے پڑوس کے گھروں سے تین آدمیوں کو بلایا۔ یہ سب اس کے رشتہ دار تھے اور اس

کے اعتماد کے لوگ تھے۔ ہماری موجودگی میں اُس نے ہمیں درپیش مشکلات سے انہیں آگاہ کیا اور اس سلسلے میں انہیں ہماری مدد کرنے کو کہا۔ تھوڑی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ موضع چندر گیر تک ہماری راہنمائی کی جائے۔ جہاں سے سُونا وَارِی کے علاقے میں داخل ہونے کے لئے کچھ اور بندوبست کیا جائے۔ چندرگیر سے آگے جانے کا بندوبست بھی ہمارے میزبان کے رشتہ داروں کو ہی کرنا تھا۔ اِن تینوں میں سے ایک نے جس کا نام غلام محمد خان تھا، ہمارے ساتھ رضا کارانہ طور پر جانے کی پیش کش کی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد تقریباً نو بجے ہم روانہ ہو گئے۔ کھیتوں کے بیچ میں سے جنوب کی جانب تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہم چندر گیر پہنچ گئے۔ غلام محمد خان ہمیں اپنے داماد کے گھر لے گیا اور دو اشخاص سے متعارف کرایا۔ ایک کا نام عبدالسلام تھا اور دوسرے کا ثناء اللہ شیخ۔ دونوں ہم سے بڑی گرم جوشی سے ملے اور ہماری خاطر مدارت کی۔ دریا عبور کرنے کی تجویز ملتوی کر دی گئی۔ کیونکہ ہمیں بتایا گیا کہ سادہ کپڑوں میں سی آئی ڈی کے کارندے دریا کے گھاٹ پر متعین کئے گئے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ دریا پار کرنے کے لئے کسی قابلِ اعتماد ملاح کی ضرورت ہے، اِس کے لئے وقت بھی درکار تھا اور مناسب منصوبہ بندی بھی۔ کیونکہ پورے علاقے میں سکیورٹی کے انتظامات بہت سخت تھے۔ تاہم ہمارے میزبانوں نے ہمیں یقین دلایا کہ اگلی صبح تک کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ چنانچہ اُن کے مشورے سے ہم نے رات کو اِسی گھر میں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بہر حال میں نے باتوں باتوں میں اُن پر یہ واضح کر دیا کہ اگر ہمیں کسی قسم کی شرارت کا شبہ ہوا تو گھر کے مکینوں سمیت مکان کو آگ لگا کر بھسم کر دیا جائیگا۔ اس کے بعد رات کا باقی حصہ ہم نے باری باری سو کر گزارہ۔ ہم تینوں اور محمد خان ایک کمرے میں ٹھہرے اور دوسرے لوگ دوسرے کمرے میں۔ سحری کے وقت محمد خان نے ہم سے اجازت چاہی اور جاتے وقت کہہ گیا کہ وہ کچھ معلومات حاصل کر کے سہ پہر کو واپس آجائے گا۔

14 دسمبر 1968ء، ثناء اللہ نے ہمیں ایک ٹرانسسٹر لا کر دیا۔ ہم اپنی پسند کے

پروگرام سُنتے رہے۔ اس کا عمر رسیدہ باپ ہمارے پاس ٹھہرا رہا تا کہ ہمیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو پوری کی جائے۔ صبح کے سات بجے ثناء اللہ نے ہم سے اجازت چاہی تا کہ وہ دفتر میں حاضری دے آئے۔ اُس نے وعدہ کیا کہ جتنا جلد ہو سکا وہ واپس آ جائے گا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اِس علاقے میں دشمن کی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ہمیں بتائے۔ عبدالسلام ایک دانش مند اور دلیر قسم کا نوجوان تھا۔ اُس نے رضا کارانہ طور پر سوپور تک ہمارے سفر کے انتظامات کرنے کا ذمہ لیا۔ دن کے دو بجے ثناء اللہ دفتر سے واپس آیا۔ اپنے ساتھ وہ اخبار روزنامہ ''آفتاب'' سری نگر لے آیا تھا۔ اخبار میں ہمارے جیل سے فرار کے بارے ایک خبر تھی۔ اور جیل حکّام کے خلاف کی گئی کارروائی کا ذکر تھا★۔ تھوڑی دیر بعد غلام محمد خان اور عبدالسلام بھی آ گئے۔

غلام محمد خان نے علاقے میں ہماری گرفتاری کے لئے سکیورٹی کے انتظامات کی تفصیل بتائی۔ عبدالسلام نے ہمارے لئے دریائے جہلم میں کشتی کے ذریعے کسی ایسے مقام تک سفر کے انتظامات کر لئے تھے جہاں سے ہم ننگل کے جنگلات سے گزر کر سوپور پہنچ سکیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ یہ سفر شام کو شروع کیا جائے۔ جب میں سفر کے انتظامات سے مطمئن ہو گیا تو میں نے غلام محمد خان کو گھر جانے کی اجازت دی۔ شام کو کھانے سے فارغ ہو کر ہم ثناء اللہ اور عبدالسلام کے ہمراہ چندر گیر سے روانہ ہو گئے۔ مغرب کی جانب کوئی میل بھر چلنے کے بعد ہم ایک ایسے گھر میں پہنچے جو بالکل الگ تھلک تھا۔ اِس میں ایک ماہی گیر رہتا تھا۔ عبدالسلام کے انتظامات کے مطابق ایک بیس سالہ نوجوان ہمارا منتظر تھا۔ گھر میں ایک عمر رسیدہ عورت نے ہمیں نمکین چائے پیش کی۔ گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ چائے پینے کے بعد ہم پانچوں گھر سے نکل کر ماہی گیر کی راہنمائی میں کوئی دو سو گز تک چلنے کے بعد دریائے جہلم کے کنارے پہنچ گئے۔ رات کی گھمبیر تاریکی میں دریا انتہائی پُرسکون اور خاموش اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ ماہی گیر کی کشتی گھاٹ پر بندھی ہوئی تھی۔ ہم اس میں

★۔ جیل وارڈن سبز ا منیم اور اُس کے ہمراہ دوسرے سیکورٹی اہلکار گرفتار کر لئے گئے تھے۔

سوار ہوئے اور ماہی گیرلڑکے نے کشتی کھینچنا شروع کی۔کوئی میل بھر تک کشتی رانی کے بعد ہم ایک گاؤں کے گھاٹ پر ٹھہر گئے اور کشتی کو ایک درخت سے باندھ دیا۔ ہمارے سامنے سوناواری کا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ ماہی گیرلڑکے کو ہمارے ساتھ وہاں تک جانا تھا۔ جہاں سے ہم ثناء اللہ اور عبدالسلام کو واپسی کی اجازت دے سکتے۔

ہم ایک کچی سڑک پر ہولیے۔تقریباً تین میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے تھوڑی دیر آرام کرنے کو کہا۔ جب ہم آرام کررہے تھے، میں نے عبدالسلام کو نزدیک بلایا اور کہا کہ میں نے پہلے سے تجویز کردہ راستہ ترک کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔اور اب بجائے خشکی کے راستے جانے کے، ہم جھیل ڈلر کو کسی مناسب مقام سے عبور کرنے کی کوشش کریں گے۔جو ہمیں **سوپور** اور **وَٹہ لَب** کے درمیان کسی مقام تک پہنچادے۔میں نے اُسے بتایا کہ یہ فیصلہ میں نے سوپور کے علاقے میں دشمن کے سکیورٹی انتظامات سے بچنے کے لئے کیا ہے کیونکہ سوپور میری نیشنل لبریشن فرنٹ کی کارروائیوں کا خصوصی مرکز رہا ہے۔میری اس نئی تجویز نے نئی مشکلیں پیدا کردیں۔

ہم نے ماہی گیرلڑکے کو بلایا اور اُس سے مدد چاہی۔سوناواری سے بانڈی پورہ اور سوپور کی جانب جھیل ڈلر میں کشتی رانی کو کشمیری زبان میں ''ھـارَاہ تـاَرْ'' کہا جاتا ہے۔اس بارے میں تفصیلی معلومات ہمیں ماہی گیرلڑکے سے معلوم ہوئیں۔اُسی سے ہمیں اِس علاقے میں آباد مچھیروں کی بستی کا بھی پتہ چلا۔صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے ہاراہ تار کو نظرانداز کرنے اور کسی دوسرے مقام سے جھیل کو عبور کرنے کا فیصلہ کیا اور ہم چل پڑے۔سیلاب کی روک تھام کے پشتوں کے ساتھ ساتھ ہم آگے بڑھتے گئے۔جھیل ڈلر کا کنارہ ہمارے دائیں ہاتھ ہمارے متوازی چل رہا تھا۔موسم سرما میں ڈلر کے پانی کی سطح گر جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں اراضی کے کئی قطعات جو گرمیوں میں پانی میں ڈوبے رہتے ہیں، باہر نکل آتے ہیں۔

پانی کے قریب تر رہنے کے لئے مچھیرے اس علاقے میں عارضی بستیاں قائم کرلیتے

ہیں جو پانی کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ منتقل ہوتی رہتی ہیں۔رات کے تقریباً دو بجے ہم جھیل وُلر کے کنارے ایسی ہی ایک بستی میں پہنچے۔جس کا نام مُقَدَّر یَار تھا۔میں نے ایک یک منزلہ جُھگی نما گھر پر دستک دی۔جُھگی میں رہائش پذیر ماہی گیر نے ہمیں غالباً کوئی چور ڈاکو سمجھ کر دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔بڑی ردّو کدّ کے بعد ہم اُسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ ہمارے کوئی خطرناک ارادے نہیں ہیں۔چنانچہ اس نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر آنے دیا۔ہم نے ماہی گیر سے اپنا مدعا بیان کیا۔کہ ہم جھیل کے اُس پار جانا چاہتے ہیں۔اُس نے کچھ پس و پیش کی۔لیکن عبدالسلام نے اُسے منہ مانگی اُجرت دینے کی پیش کش کی تو وہ آمادہ تو ہو گیا لیکن کہنے لگا کہ دن چڑھنے سے پہلے وہ پار جانے کے لئے تیار نہیں۔اُس نے ہمیں بتایا کہ جھیل کا پانی صرف صُبح کے وقت پُرسکون ہوتا ہے اور قابلِ کشتی رانی ہوتا ہے۔شب و روز کے بقایا اوقات میں جھیل خوفناک لہروں کی زد میں ہوتی ہے۔اس کا مجھے پہلے ہی علم تھا۔چنانچہ ہم نے صبح کا انتظار کیا۔ماہی گیر کی بیوی کو جواب تک محوِ خواب تھی، بیدار کیا گیا اور اُسے چائے بنانے کے لئے کہا گیا۔اُس نے تھوڑی ہی دیر میں چائے بنا کر پیش کر دی۔چائے کی پتی اور چینی ہم نے اُسے مہیا کی۔چائے ہم نے چاول کے آٹے سے پکائی ہوئی روٹیوں کے ساتھ پی لی۔یہ روٹیاں ہم اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔

ماہی گیر کی بیوی نفسیاتی مریضہ تھی۔اُسے وہم تھا کہ اُس پر جنوں بھوتوں کا سایہ ہے۔چنانچہ اُسے دورہ پڑا تو وہ عجیب و غریب حرکات کر کے اور چیخیں مار کر پریشان کُن صورتِ حال پیدا کر دیتی۔میں نے قرآنِ شریف کی چند آیتیں پڑھ کر اُس پر دم کیا، اس کے علاوہ میں نے تھوڑا سا نمک لے کر اُس پر آیت کریمہ پڑھ کر دم کیا۔میں نے اُسے ہدایت کی کے اِس نمک میں سے تھوڑا سا چائے یا پانی میں حل کر کے روزانہ استعمال کیا کرے۔خدا نے چاہا تو بڑی جلدی جنوں اور بھوتوں سے نجات مل جائے گی۔اُس نے ہمارے آنے کو اپنے لئے خوش قسمتی سمجھا اور دعائیں دینے لگی۔صُبح کے چھ بجے تک ہم مچھیرے کے ساتھ ٹھہرے رہے۔عبدالسلام نے اُسے اپنی گرہ

سے کچھ رقم دے دی اور ہم کشتی میں سوار ہو گئے۔ کشتی میں سوار ہونے سے قبل ہم نے اپنے تینوں ہمدرد ساتھیوں ثناءاللہ، عبدالسلام اور ماہی گیر کے لڑکے کو الوداع کہا۔

ہمیں جھیل کو عبور کرنے میں تقریباً تین گھنٹے لگے اور تقریباً دس بجے ہم نے **سَنُگرُ** کے مقام پر جھیل کے ساحل کو چھو لیا۔ سنگر اس ٹیلے کا نام ہے جس کی چوٹی پر بابا شکرُالدین ولیؒ کا مقبرہ ہے۔ اس مقام سے زینہ گیر اور سوناواری کا پورا علاقہ نظر آتا ہے اور یہیں سے پہاڑوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے جو سوپور اور بانڈی پورہ کی وادیوں کے درمیان دور تک چلا جاتا ہے۔

سلسلہ کوہ کے دامن میں پہنچ کر ہم نے اپنا سفر نہر زینہ گیر کے کنارے کے ساتھ جاری رکھا۔ تقریباً چار گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم سیبوں کے ایک باغ میں پہنچے اور کچھ دیر آرام کیا۔ ہم غروبِ آفتاب تک یہیں رُکے رہے۔ میر احمد کو ایک قریبی گاؤں میں بھیجا۔ یہاں عبدالرحمٰن میر نام کا ہمارا ایک ساتھی رہتا تھا★1۔ اُس سے رابطہ ہو جانے کے بعد ہم تینوں اُس کے گھر چلے گئے اور رات کا کھانا اُس کے گھر کھایا۔ یہاں ہم نے ایک اور سابقہ ساتھی محمد مقبول میر سے رابطہ قائم کیا۔ مقبول میر ایک خوش حال کسان تھا۔ اس کا کپواڑہ میں کچھ کاروبار بھی تھا۔ یہ رات ہم نے اُسی کے گھر گزاری۔

16 دسمبر 1968ء، اگلی صبح ہم نے آس پاس کے علاقے سے سکیورٹی انتظامات کے بارے میں کچھ معلومات کے لئے مقبول میر کو بھیجا۔ اس کے علاوہ ہمیں کچھ چائے، چینی اور سگریٹوں کی بھی ضرورت تھی۔ مقبول میر شام کو مذکورہ اشیاء کے علاوہ ضروری معلومات لے کر واپس آیا۔ عبدالرحمٰن میر کے ذمہ یہاں سے آگے کے سفر کے انتظامات کئے گئے تھے۔ یہ ہمارے سفر میں وادی کے اندر آبادی والا آخری علاقہ تھا اور یہاں سے سیدھا حدِ متارکہ جنگ کی طرف پیش قدمی کرنی تھی۔ ہمارے اندازے کے مطابق یہاں سے چار دن کے پیدل سفر کے بعد حدِ متارکہ جنگ کے اُس پار پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن کو اس کے مطابق پکے ہوئے اور خشک سامان خورونوش کا بندوبست کرنا تھا جس میں چاول، آٹا، ستو، کھانڈ، نمک، روٹیاں، اچار اور کچھ

★1۔ عبدالرحمٰن میر محاذ رائے شماری کے کارکن تھے۔ یہ بھی حُریت پسندانہ سرگرمیوں کی پاداش میں جیل کاٹ چکے تھے۔

دیگر اشیاء شامل تھیں۔ ہم نے اس کے علاوہ ایک کلہاڑی، کھانے پکانے کے چند برتن، ایک ٹارچ اور سفر کے لئے گھاس کی چند پولیں حاصل کر لیں۔ عبدالرحمٰن نے ہمیں کچھ گرم پٹیاں اور بھیڑ کی کھالیں بھی مہیا کیں تاکہ برفانی سفر کے دوران پیروں اور ٹانگوں کو سردی سے محفوظ رکھا جا سکے۔ برفانی علاقوں میں عام جوتے اور جرابیں کام نہیں دیتے چنانچہ دیہاتی لوگ اپنے پاؤں کو اُونی کپڑے یا بھیڑ کی کھال لپیٹ کر گھاس کی بنی ہوئی پولیں کس لیتے ہیں۔ ٹانگوں کو گھٹنوں تک تقریباً چار انچ چوڑی اُونی پٹی سے لپیٹا جاتا ہے۔ اس طرح پاؤں برف پر پھسلن سے بچاؤ کے علاوہ برف کے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔

دن بھر مکمل آرام کرنے کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ عبدالرحمٰن اور دو اور اشخاص نے کچھ فاصلے تک ہمارا ساتھ دیا اور اُن کی مدد سے ہم نے دریائے پوہرو کو ایک کشتی کے ذریعے عبور کیا۔ یہاں سے ایک کچی سڑک کے ذریعے رفیع آباد کے علاقے سے گزرتے ہوئے بارہ مولا شہر کے شمالی جانب تھانہ پنزلہ کی حدود میں ایک جنگل کے دامن میں پہنچ گئے۔

عبدالرحمٰن اور دوسرے دو ساتھیوں کو دریائے پوہرو کو عبور کرنے کے بعد واپس بھیج دیا گیا۔ ہم نے جنگل کے اندر جا کر ایک جگہ خود چائے تیار کی اور ذرا آرام کیا۔ ہم نے طے کیا تھا کہ ہم حدِ متارکہ جنگ کو قاضی ناگ کے علاقے سے پار کریں گے۔ اگرچہ یہ بہت کٹھن راستہ تھا لیکن اس کے سوا اور کوئی چارا نہ تھا۔ غلام یٰسین کو اس علاقے اور یہاں کے جنگلات سے کچھ واقفیت تھی۔ وہ 1965ء کی کمانڈو کارروائیوں کے دوران اسی راستے سے آزاد کشمیر میں داخل ہوا تھا۔ علاوہ ازیں اس علاقے میں سر بفلک چوٹیاں جن کی اونچائی بعض مقامات پر 14 ہزار فٹ تک پہنچتی ہے، عام لوگوں کے لئے دشوار گزار تھیں، چنانچہ اس علاقے میں دشمن کی موجودگی کا بہت کم امکان تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ حدِ متارکہ جنگ سے ملحق آبادیوں میں ہماری گرفتاری کے لئے بھارتی فوج کے دستے بہت بڑے پیمانے پر گھر گھر چھاپے مار رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاستی سی آئی ڈی نے بھارت نواز عناصر خاص طور پر نمبرداروں اور چوکیداروں کو چوکنا کر دیا تھا کہ اگر انہیں کہیں خوراک یا پناہ کی تلاش میں کوئی اجنبی سرگرداں ملے تو اُن کی اطلاع فوراً پولیس کو

دی جائے۔ ریاستی حکام نے ہماری تصویروں والے بڑے بڑے پوسٹر جگہ جگہ چسپاں کرا دیئے تھے۔ جن میں ہماری گرفتاری کے بارے میں اطلاع دینے والے کو دس ہزار روپے انعام دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اِن میں لوگوں کو خبردار کیا گیا تھا کہ اگر کسی نے ہماری کسی قسم کی مدد کی تو اُسے سات سال سزائے قید دی جائے گی۔

17 دسمبر 1968ء **پنزلہ** کے جنگل سے ہم لوگ شمال کی جانب نوگام کی طرف روانہ ہوئے، چونکہ یہاں سے دن کی روشنی میں ہمیں سفر کرنا تھا۔ اس لئے ہم نے حتیٰ الامکان گھنے جنگل کے بیچ میں سے پیش قدمی جاری رکھی۔ اس پورے سفر کے دوران ہم آبادی سے دور دور رہے۔ ہماری رفتار بہت سُست تھی۔ اور ہمیں ایک ایک قدم پھُونک پھُونک کر اٹھانا پڑ رہا تھا۔ تا کہ کسی کی نظر میں نہ آسکیں۔ ایک دو مقامات پر ہمارا سامنا کسی راہ رَو سے ہوا تو ہم نے فوراً کسی نزدیکی گاؤں کا اَتہ پتہ پوچھ کر پِنڈا چھڑایا۔ چار بجے کے قریب ہم دُودھ کُول پہنچے۔ یہ جگہ نوگام اور حمام مَرکُوٹ کی وادی کے درمیان ہے۔ ہم جنگل کی ٹیکری پر چڑھ گئے۔ ہماری دائیں جانب نوگام کا نالہ تھا اور بائیں ہاتھ حمام مرکوٹ کا نالہ۔ چڑھائی آسان تھی اور اسے بغیر کسی دقّت کے طے کیا۔ ٹیکری کے ساتھ ساتھ ہم نے اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ ہم برفانی علاقے میں داخل ہوگئے۔ شام پڑتے ہی چیڑھ کے گھنے جنگل میں ہم نے شب بسری کے لئے ایک مقام کا انتخاب کیا۔ آگ جلائی، کچھ کھانے کا بندوبست کیا اور رات باری باری سو کر کاٹی۔

18 دسمبر 1968ء۔ اگلی صبح ہم نے قاضی ناگ گلی کی طرف سفر شروع کیا۔ یہاں ہم نے اپنے بوٹ اتار دیے اور ان کے بدلے گرم پٹیاں، بھیڑ کی کھالیں اور پُولیں کس لیں۔ اِن کے علاوہ پاؤں کو برف کے اندر دھنسنے سے بچانے کے لئے پُولوں کے ساتھ لکڑی کی چپٹیاں باندھ لیں۔ اب ہمارا سفر بہت دشوار مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔ ہم پہلے جیسی رفتار کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ برف سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں پولوں میں بندھی ہوئی چپٹیاں اتارنی پڑیں، کیونکہ اِن کی وجہ سے ہماری رفتار بالکل ہی کم ہو کر رہ گئی تھی۔ تاہم لیٹین نے اپنی چپٹیاں بندھی رہنے دیں۔ کیونکہ اُسے اِن کے ساتھ چلتے رہنے کا خاصا تجربہ تھا۔

دو بجے سہ پہر ہم قاضی ناگ گلی کے دامن میں پہنچ گئے۔ اُس جگہ پہنچ کر ہم نے اپنا رُخ مغرب کی طرف کیا اور گلی پر چڑھنے لگے۔ گلی کی چڑھائی چڑھنے سے قبل ہم نے بہک کے ایک کوٹھے میں آرام کیا۔ (پہاڑی علاقوں میں بکروال گرمیوں کے موسم میں اپنے مویشیوں کو اونچی چراہ گاہوں میں لے جاتے ہیں۔ یہ چراہ گاہیں "بہکیں" کہلاتی ہیں اور ان میں عارضی رہائش کے لئے کوٹھے تعمیر کیے جاتے ہیں جو سردیوں میں خالی پڑے رہتے ہیں۔) ہم نے یہاں اپنے لئے کھانا پکایا اور کھانا کھانے کے بعد گلی پر چڑھنا شروع کیا۔ چڑھائی بہت خطرناک تھی۔ کہیں کہیں ہم کمر کمر برف میں دھنس جاتے۔ اِس وجہ سے ہماری رفتار بہت ہی سُست تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ موسم بہت صاف تھا۔ اور سورج آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ ہم نے چڑھائی شام تک جاری رکھی۔ یہ پہاڑ جنگلوں سے بھرا پڑا تھا۔

ہماری اگلی منزل **ڈُبری ٹاپ** تھی۔ دن ڈھلنے کے بعد میرے ساتھی جنگل میں ستانا چاہتے تھے لیکن میں نے اُنکی اِس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ کیونکہ ہم نے ابھی بہت ہی کم فاصلہ طے کیا تھا اور ہمارے پاس راشن کی مقدار کم ہوتی جارہی تھی۔ چنانچہ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جب تک ہم اپنے سفر میں روزانہ نسبتاً زیادہ فاصلہ نہ طے کریں ہم منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ اور راستے میں ہی مر کھپ جائیں گے۔ ہم اپنے ساتھ خورونوش کا سامان صرف چار دن کا لے کر چلے تھے۔ جس میں سے دو دن کی خوراک خرچ ہو چکی تھی۔ چنانچہ برف پر ستاروں کی کرنوں سے پیدا ہونے والی روشنی میں ہم نے چوٹی کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ تقریباً دو بجے شب ہم ڈبری ٹاپ سے ایک ہزار گز کے فاصلے پر رہ گئے۔ یہاں پر ایک چھوٹا سا میدان تھا جس میں کوئی درخت وغیرہ نہ تھا۔ خوش قسمتی سے یہاں بھی ہمیں بہک میں بنا ہوا ایک کوٹھا مل گیا۔ ہم اس میں داخل ہوئے، کھانا پکایا اور کھانے کے بعد آرام کرنے کی غرض سے سو گئے۔

19 دسمبر 1968ء۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہم نے اپنا سامان اٹھایا۔ کوٹھے کو خیر آباد کہا اور بلندی کی طرف سفر جاری رکھا۔ ہم ڈبری ٹاپ پر پہنچے تو سورج چمک رہا تھا۔ اور ہمارے سامنے دور دور تک پھیلی ہوئی برف پوش چوٹیاں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ ڈبری

ٹاپ عبور کرنے کے بعد ہم ایک سطح مرتفع میں آ گئے۔ ایسی جگہ کو کشمیری زبان میں ''سنگرمال'' کہتے ہیں۔ صبح دس بجے کا وقت تھا۔ ہم ایسے مقام پر تھے جہاں سے تھوڑی دور اور جانے کے بعد وادی ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے رُک گئے۔ میں نے وادی پر ایک آخری نگاہ ڈالی۔ سورج ہمارے سر پر تھا۔ لیکن جب میں نے وادی پر نظر ڈالی، مجھے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔ کیونکہ اِس مقام سے ہزاروں فٹ نیچے گہرے بادلوں نے سارے علاقے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کی وجہ سے میں اپنی اس دلفریب اور حسین وادی کو ایک نظر نہ دیکھ سکا۔ جس کی آزادی کے لئے میں نے اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈالا تھا۔

ہم سطح مرتفع سے آگے روانہ ہوئے۔ اب جو سفر درپیش تھا اس میں کہیں ڈھلوانیں تھیں ,کہیں چھوٹی موٹی چوٹیاں اور کہیں چٹانوں پر سے گزرنا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ سارا علاقہ دھوپ کی براہِ راست زَد میں تھا۔ موسم صاف ہونے کی وجہ سے رات کی خنکی نے برف کی بالائی سطح کو سخت کر دیا تھا۔ اس طرح اب ہمارے لئے برف میں دھنسنے کا خطرہ کم ہو گیا تھا۔ میں اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنا چاہتا تھا۔ دن کے دو بجے کے قریب ہم سطح مرتفع کے کنارے ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے آزاد کشمیر کی جانب پہاڑی چوٹیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ اس سطح مرتفع کی بلندی 14 ہزار فٹ ہے۔ یہاں سے قاضی ناگ کے کوہستان کے کئی سلسلے مختلف اطراف میں پھیلتے ہیں اور ان میں سے کئی نالے پھوٹ کر دریائے جہلم یا دریائے کشن گنگا (دریائے نیلم) اور دریائے پوہرو میں جا گرتے ہیں۔ ان نالوں کی تعداد سات یا نو ہے ۔سطح مرتفع کا آس پاس کا علاقہ جنگلات سے بالکل خالی تھا اور ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس گنجے پہاڑی سلسلے کو عبور کر کے شام پڑنے سے پہلے کسی جنگل میں پہنچنا تھا تا کہ رات گزارنے کا کوئی بندوبست ہو سکے۔

میں نے نیچے نگاہ دوڑائی تو بائیں ہاتھ ایک جنگل قریب تر نظر آیا۔ ہم نے اسی کی طرف بڑھنا مناسب سمجھا۔ اُترائی بہت تیکھی ہونے کی وجہ سے انتہائی دشوار تھی۔ ہم نے سیدھا نیچے جانے کی بجائے ترچھی سمت میں قدم جما جما کر اترنا شروع کیا۔ ہم نے ایک دوسرے کے مابین پندرہ

سے بیس گز کا فاصلہ رکھا۔ ایک جگہ پر میر احمد اپنا توازن کھو بیٹھا اور پھسل کر دور تک برف کی سطح پر لڑھکتا چلا گیا۔ مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے۔ میں اپنی بھاری لاٹھی کو برف کے اندر دبا کر اس کے سہارے خود ایک چٹان کی مانند کھڑا ہو گیا تا کہ میر احمد کو سہارا دے سکوں۔ جو کہ میرے پیچھے لڑھکتا چلا آ رہا تھا۔ بڑی مشکل کے ساتھ اِس خطرناک اترائی کو عبور کر کے ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں سے ایک نالہ پھوٹ کر گہرائیوں میں جا گرتا تھا۔ نالے کے کنارے کنارے تیز تر رفتار سے ہم جنگل کی طرف بڑھنے لگے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم نے ایک کوٹھا تلاش کر لیا۔ شام پڑ چکی تھی۔ جب ہم قریب پہنچے تو ہم نے دیکھا یہ کوٹھا دراصل ایک سرحدی چوکی ہے۔ جو اِن دِنوں سرما کی وجہ سے خالی چھوڑی گئی ہے۔ ہم نے چوکی کی تلاشی لی۔ اس میں ہندی میں لکھے ہوئے چند خطوط اور ڈالڈا کے خالی ڈبوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ تاہم اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ بھارتی فوج کی چوکی ہے اور اب ہم حدِ متارکہ جنگ کے قریب آ چکے ہیں۔ جس نالے کے کنارے ہم سفر کر رہے تھے۔ وہ نیچے جا کر مقبوضہ کشمیر کے اُوڑی علاقے میں جا گرتا تھا۔ یہاں کچھ کھانا تیار کرنے کے بعد ہم نے آرام کیا تا کہ اگلے دن تازہ دم ہو کر سفر جاری رکھ سکیں۔

20 دسمبر 1968ء۔ اگلی صبح ہم نے نالے کو چھوڑ کر مغرب کی جانب پہاڑ کی تیکھی ڈھلوان پر چڑھنا شروع کیا۔ یہ چڑھائی بھی خاصی مشقّت طلب تھی۔ ایک ایک قدم پاؤں جما جما کر برف میں راستہ بنانا پڑتا تھا اور یہ کام ہم باری باری آگے ہو کر کرتے رہے۔ سارے دن کی محنت شاقہ کے باوجود اس روز ہم پہاڑ کی چوٹی پر نہ پہنچ سکے۔ پہاڑی سفر میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آپ تھکا دینے والے سفر کے بعد ایک چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں تو آگے ایک اور چوٹی سر نکالے کھڑی ہوتی ہے۔ اور یوں یکے بعد دیگرے کتنی ہی چوٹیاں آخری چوٹی سمجھ کر سر کرنی پڑتی ہیں۔ ہم نے پہاڑ کے جنگلات پر مشتمل حصہ غروبِ آفتاب تک طے کر لیا اور ایک چوٹی پر ایک بڑی سی چٹان کے سائے میں رُک کر آرام کرنے لگے۔ ہم نے بھُوج پتر کا ایک پودا کاٹ کر آگ جلانے کا بندوبست کیا۔ بھُوج پتر کی چھال ہلکے بھورے رنگ کے بہت عمدہ اور صاف کاغذ کی تہوں جیسی بنی

ہوتی ہے۔ ہمارے پاس راشن قریب الاختتام تھا۔ چنانچہ ہم نے بچے کھچے چاول، ستو اور چائے کی پتی کو ایک ساتھ اُبال کر اس میں نمک ڈال دیا اور اس طرح جو ملغوبہ تیار ہوا۔ وہ سفر کی تھکان کی وجہ سے ہمارے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ اگر چہ ہم نے آگ جلا رکھی تھی۔ لیکن شدت کی سردی کی وجہ سے ہم سو نہ سکے۔ ہم اگر اپنا رخ آگ کی طرف کرتے تو پیٹھ یخ بستہ ہونے لگتی اور اگر ہم پیٹھ آگ کی طرف کرتے تو جسم کا سامنے کا حصہ یخ بستہ ٹھنڈی ہواؤں سے اکڑنے لگتا۔ بہر حال آگ نے ہمیں اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ اتنی بلندی پر کھلے آسمان کے نیچے یخ بستہ ہواؤں میں ہمارے جسم برف کی طرح جم کر اکڑ جانے سے بچ گئے۔

21 دسمبر 1968ء۔ اگلی صبح سورج نکلنے کے بعد ہم نے سفر شروع کیا۔ دوپہر تک ہم سیدھی چڑھائی چڑھتے رہے۔ اس کے بعد شمال مغرب کی طرف رُخ موڑ لیا۔ یہاں سے ہمیں ایک گلی کے راستے اس پہاڑ کو عبور کرنا تھا۔ بسا اوقات ہمیں بالکل سیدھی ایستادہ چٹانوں پر چڑھنا پڑتا۔ اور بعض اوقات چٹانوں سے بچنے کے لئے لمبا چکر کاٹ کر آگے بڑھنا پڑتا۔ دو بجے سہ پہر ہم گلی کے دامن میں پہنچ گئے۔ ہم اس سے کہیں پہلے یہاں پہنچ گئے ہوتے اگر راستے میں چھوٹا سا حادثہ پیش نہ آتا۔ دورانِ سفر ایک جگہ میرا پاؤں پھسل گیا اور میں لڑھکتا ہوا نیچے نالے میں گر پڑا۔ میرے ساتھی اُفتاں و خیزاں مجھ تک پہنچے اور بڑی مشکل سے مجھے واپس اوپر لے آئے۔ اس حادثے میں میرا ہاتھ ایک چٹان سے لگ کر زخمی ہو گیا۔ لیکن چونکہ یہاں کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی کم تھا۔ اس لئے زیادہ خون نہیں بہا۔ ہم نے بلندی کی طرف سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ہم اس ٹیکری تک پہنچ گئے جس کو ''سَت سری'' کہا جاتا ہے۔ یہاں سے سات نالے پھوٹتے ہیں جو بعد میں پھیل کر کچھ تو آزاد کشمیر میں چلے جاتے ہیں اور کچھ مقبوضہ کشمیر میں ★[1]۔

ٹیکری پر پہنچ کر ہمیں ایک اور سطح مرتفع کو عبور کرنا پڑا۔ اب ہمیں ایک ڈھلوان در پیش تھی۔

★[1]۔ اِن سات نالوں کے نام یہ ہیں۔

قاضی ناگ نالہ، پوَھر و نالہ، وَارنی نالہ، چَھم نالہ، کرناہ نالہ، درنگ بل نالہ، لَمبر نالہ

جسے آزاد کشمیر میں چھمب نالہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ نالہ قاضی ناگ کے دھانے سے پھوٹ کر جنوب مغرب کی سمت بہتا ہے۔ اگر چہ اس علاقے سے پہلے واقفیت نہ تھی تاہم مجھے یقین تھا کہ آزاد کشمیر کے علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔ شام ہونے تک ہم نے نالے کا بیشتر گنجا علاقہ طے کر لیا اور جنگل میں داخل ہو گئے۔ پڑتل کے ایک درخت کے نیچے ڈیرہ ڈال کر ہم نے آگ جلائی لیکن اب ہمارے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ نہ تھا۔ سوائے سبز چائے کی تھوڑی سی پتی کے۔ ہم نے نمکین چائے تیار کی۔ اور بغیر دودھ کے ایک ایک پیالی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ تھکے ماندے اور خالی پیٹ ہونے کے باوجود ہم سو گئے۔

22 دسمبر 1968ء۔ اگلی صبح چھمب نالے کے ساتھ ساتھ ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ دوپہر تک ہم نے برفانی علاقہ طے کر لیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ ہمارا سفر گھنے جنگل کے بیچ چھمب نالے کے کنارے جاری رہا۔ شام پڑنے پر نالے کے کنارے ہی ایک سر بفلک چٹان کے سائے میں ہم آرام کے لئے ٹھہر گئے۔ برفانی علاقے میں سے گزر آنے کے بعد ہماری یخ بستہ پولوں کے اندر کچھ حرارت پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہمیں اپنے پاؤں میں شدید درد محسوس ہونے لگا۔ ہمارے پاؤں برف سے جل گئے تھے اور ہماری پولوں کی رسیوں نے ہمارے پاؤں اور ٹخنوں میں زخم ڈال دیئے تھے۔ تاہم ہم نے پولوں کو بندھا رہنے دیا کہ کہیں ہمارے زخم ننگے ہو کر چلنے پھرنے سے معذور نہ کر دیں۔ درد شدید تھا۔ اور آگ پر پاؤں گرم کرنے کی وجہ سے اس شدت میں اور اضافہ ہونے کا احتمال تھا۔ اس لئے ہم نے اپنے پاؤں آگ کی گرمی سے دور رکھے۔ میر احمد کے پاؤں کی حالت بہت بری تھی۔ وہ درد کی وجہ سے رات بھر ایک لمحہ بھی نہ سو سکا اور ہم بیٹھے اُسے تسلیاں دیتے رہے۔

23 دسمبر 1968ء۔ صبح ہونے پر نالے کے ساتھ ساتھ اِس اُمید پر ہم نے سفر جاری رکھا کہ ہم کسی بستی میں پہنچ جائیں گے۔ ایک دو مقامات پر ہم بہکوں میں سے گزرے' یہ اس چیز کی علامت تھی کہ اب آبادی والا علاقہ زیادہ دور نہیں ہے۔ سفر کے ساتھ ساتھ ہمارے پاؤں کے درد

میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دوپہر کے قریب جب ایک مقام پر تھوڑی دیر ستانے کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کرنا چاہا تو میر احمد نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ شدتِ درد سے بلبلا رہا تھا۔ اُس نے ہم سے کہا کہ ہم سفر جاری رکھیں اور اُسے اِس کے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ درد کی وجہ سے ایک قدم بھی آگے بڑھانے سے معذور ہو گیا تھا۔ جب ہم کسی طرح اُس کو چلنے پر آمادہ نہ کر سکے تو مجھے غصہ آیا اور میں نے اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اور وہ میری منتیں کرنے لگا کہ وہ بالکل چلنے کے قابل نہیں۔ اس لیے اس کو چھوڑ دیا جائے ★1۔ میں نے اُس سے اُس کا سارا سامان لے کر اٹھایا اور اُسے اپنی بغل میں لے کر ساتھ چلنے پر مجبور کیا کہیں اگر تھوڑی بہت چڑھائی آتی ہم اُسے اُٹھا کر اُوپر لے جاتے اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو سرینگر جیل کی پھانسی کی کوٹھڑی سے بچ نکلنے کے بعد یہاں کے برفانی پہاڑوں میں اُس کی موت یقینی تھی۔ سہ پہر کو گھنے جنگل کو عبور کر کے ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گے جہاں موضع چھمب صاف نظر آ رہا تھا۔

اُترائی اُترتے وقت چند سو گز نیچے ہمیں ایک آدمی نظر آیا۔ اُسے آواز دی اُس نے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس مقام پر پہنچ گے۔ غلام یسٰین نے اُس سے بات کی اور پوچھا کہ اِس گاؤں کا نام کیا ہے؟ کیا یہ حدِ متارکہ جنگ ہے؟ پاکستان کس جانب ہے؟ اس بات کا اطمینان ہو جانے کے بعد ہم نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اپنے گھر لے چلے ہم نے اُسے بتایا کہ ہم سرینگر جیل سے بھاگ آئے ہیں۔ یہ عید کا دوسرا دن تھا۔ ہماری عید جہاں گزری جس طرح گزری وہ سُنا چکا ہوں۔ ہم عید اُس روز منائیں گے جس روز کشمیر آزاد ہوگا ★2۔

★1۔ اِس برف پوش پہاڑی سفر میں میر احمد کے ایک پاؤں کی انگلی اور انگوٹھا برف میں جل کر گر گیا جب کے دوسرے پاؤں کی ایک انگلی بھی جل گئی۔ رانوں کے نیچے اُس کا جسم سُن ہو چکا تھا۔ وہ اپنے جسم کو گھسیٹتے ہوئے یہاں تک آیا تھا۔ اُسے اب برف پر ننگے پاؤں چلنے سے بھی کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک زندہ لاش کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے نہایت مایوسی اور نا اُمیدی میں اپنے ہم سفر ساتھیوں سے کہا کہ وہ اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلے جائیں۔ لیکن اُس کے ساتھیوں نے اُسے اِس حال میں چھوڑ کر جانا گوارہ نہ کیا۔

★2۔ میر احمد نے بتایا کہ اُنھوں نے نمازِ عید اسی حالت میں ادا کی اور مقبول بٹ شہیدؒ نے اپنے دوستوں سے کہا۔ ''ہماری سب سے بڑی عید وہ ہوگی جب ہم کشمیر کا جشنِ آزادی منائیں گے''۔ ہم نے اللہ سے دعا کی کہ وہ اس سفر میں ہماری جان نہ لے لے۔ کیونکہ ابھی ہمارے بہت سے ارمان باقی ہیں۔

اُس شخص نے اپنا نام شاہ محمد بتایا★[1]۔ اُس کے گھر پہنچے تو ہم نے اُس سے کہا کہ ہم گزشتہ تین روز کے بھوکے ہیں۔ ہمیں کچھ کھانے کو دے۔ اُس نے جلدی جلدی چاول پکوائے۔ آلو کا سالن تیار کروایا اور ہمیں کھانا کھلایا۔ ہم نے یہاں کچھ آرام کیا اور پولیس اتار دیں۔ ہمارے پاؤں گَل چکے تھے اور ہمارے زخموں سے خون رس رہا تھا۔ شاہ محمد کے گھر ہماری ملاقات اس کے دوست محمد یعقوب سے بھی ہوئی جو گاؤں میں دکان داری کرتا تھا★[2]۔ وہ اُس روز شاہ محمد کے گھر والوں کو عید مبارک کہنے آیا تھا۔ اِس گھر میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے طے پایا کہ غلام یسٰین اور میں محمد یعقوب کے ساتھ جا کر اُس کے ساتھ رات گزاریں اور میر احمد، شاہ محمد کے گھر آرام کرے۔ میر احمد درد کے مارے کراہ رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ شب بھر کے آرام کے بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہو جائے گی اور ہم سفر جاری رکھ سکیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں محمد یعقوب کے ساتھ اس کے گھر روانہ ہوئے اور شاہ محمد کو ہدایت کر گئے کہ وہ اگلی صبح میر احمد کو یعقوب کے گھر پہنچا دے۔ یعقوب کے گھر ہماری بہت خاطر تواضع ہوئی اور ہمارے برف سے جلے ہوئے پاؤں کے لیے کچھ مقامی علاج بھی کیا گیا۔

یعقوب کے گھر کچھ اور مقامی لوگ بھی جمع ہو گئے۔ انہوں نے ہمیں مبارک باد دی اور ہمیں بتایا کہ آزاد کشمیر فوج کی ایک چوکی یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہے★[3]۔ طے پایا کہ ہماری آمد کی اطلاع چوکی پر دی جائے۔ اس کام کے لیے ایک مقامی مجاہد کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جس نے صبح سویرے یہ کام سرانجام دینے کا وعدہ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک طویل صبر آزما حوصلہ شکن اور کٹھن سفر کے بعد ہم ایک گھر کے اندر گرم کمرے میں آرام کی نیند سو رہے تھے۔

★1۔ **شاہ محمد** بارہ مولہ کے گاؤں شاہ کوٹ کا رہنے والا تھا۔ وہ 1958ء میں وہاں سے ترکِ سکونت کر کے چھمب آباد ہو گیا۔ وہ زندگی بھر مال مویشی پالنے اور زمینداری کے پیشے سے وابستہ رہا۔ مقبول بٹ شہیدؒ اور اُن کے ساتھیوں کو اپنے گھر ٹھہرانے کی پاداش میں وہ بھی مظفر آباد کے بلیک فورٹ میں FIU کے ہاتھوں جبر و تشدد کا نشانہ بنا۔ شاہ محمد کچھ عرصہ میرپور میں محنت مزدوری کرتا رہا۔ وہ 2003ء میں 80 برس کی عمر میں فوت ہوا۔

★2۔ **محمد یعقوب** بارہ مولہ کے علاقہ لمبر کا رہنے والا تھا۔ یہ بھی ترکِ سکونت کر کے چھمب میں آباد ہوا تھا۔ وہاں گاؤں میں ہی اُس کی دکان تھی۔ وہ 1985ء میں فوت ہوا۔

★3۔ یہ 8AK کی چوکی تھی۔

24 دسمبر 1968ء۔ شاہ محمد، میر احمد کو ساتھ لے کر طے شدہ پروگرام کے مطابق علی الصبح یعقوب کے گھر پہنچا۔ ہماری آمد کی خبر آس پاس کے لوگوں میں پھیل گئی تھی۔ چنانچہ صبح کے وقت کچھ لوگ ہمیں مبارک باد دینے آئے۔ کچھ دیر بعد مقامی مجاہد آزاد کشمیر فوج کی چھمب چوکی سے ایک سپاہی کو ساتھ لے کر واپس آیا۔ ہم نے ناشتہ کیا۔ چونکہ ہم اپنے پاؤں پر چلنے سے معذور تھے اس لیے مقامی لوگوں نے ہمیں پیٹھوں پر اُٹھایا۔ اور تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم چوکی پر پہنچے۔ یہاں ایک صوبیدار نے ہمارا استقبال کیا، جس نے گاؤں والوں کو رخصت کرنے کے بعد ہمیں چائے اور کھانا کھلایا۔ ہماری آمد کی اطلاع سنیئر افسران کو کر دی گئی۔ میں نے ذاتی طور پر فورس کمانڈر سے ٹیلیفون پر بات کی جو کسی اور چوکی پر تھا۔ کمانڈر نے مجھے بتایا کہ وہ ہماری آمد کی رپورٹ افسران بالا کو دے گا۔ اور جوں ہی کوئی فیصلہ ہوا ہمیں اطلاع کر دی جائے گی۔ میں صوبیدار کے بنکر میں دو گھنٹے تک اس سے بات چیت کرتا رہا۔ میر احمد اور غلام یٰسین سپاہیوں کے ساتھ دوسرے بنکر میں گپ شپ کرتے رہے۔ آخر ہدایات موصول ہوئیں کہ ہمیں چناری کے علاقے میں بٹالین ہیڈ کوارٹر پہنچانے کا بندوبست کیا جائے۔ جہاں سے ہمیں ایف۔ آئی۔ یو کے حوالے کیا جانا تھا۔ میرے لیے ایک گھوڑے کا بندوبست کیا گیا۔ میر احمد کو لے جانے کے لیے قلیوں کا بندوبست کیا گیا۔ غلام یٰسین کے لیے بھی قلیوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ لیکن اس نے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ کیونکہ اس کے پاؤں برف کی وجہ سے زیادہ نہیں جلے تھے۔

اُس روز موسم ابر آلود تھا۔ صبح کے وقت جب ہم چوکی میں پہنچے تھے تو برفباری شروع ہو گئی تھی اور جس وقت ہم چوکی سے **ساوَنْ کچھا** کے لیے روانہ ہوئے کوئی نو انچ برف گر چکی تھی اور برفباری ابھی جاری تھی۔ میں نے خداوندِ قدوس کا شکر ادا کیا۔ کہ اس نے ہم پر بڑا رحم و کرم کیا ہے۔ اگر وادیٔ کشمیر سے چھمب تک کے سفر کے دوران کسی روز برف باری ہوتی تو ہم دورانِ سفر کہیں مر کھپ گئے ہوتے اور کسی کو ہمارا کوئی نشان تک نہ ملتا۔ ساون کچھا کے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں ہم رات کے وقت پہنچے۔ اگلے روز صبح سویرے ناشتے پر میس کے اندر آزاد کشمیر فوج کے افسروں سے میری بات چیت ہوئی۔

یہ 25 دسمبر 1968ء کی تاریخ تھی۔ ایف، آئی، یو، کا ایک جے سی او کیمپ میں آیا۔ اور ہم سے سوالات پوچھے۔ فوجی ڈاکٹر نے ہمیں ابتدائی طبی امداد بہم پہنچائی۔ بہت دن بعد میں نے شیو بنائی اور گرم پانی سے منہ دھویا۔ کچھ دیر بعد ایف آئی یو کا متذکرہ جے سی او ایک جیپ لے کر پھر واپس آیا۔ اور ہم تینوں کو اپنے ساتھ مظفر آباد لے گیا۔ مظفر آباد پہنچ کر ہمیں سیدھا گوجرہ کے قلعے میں لے جایا گیا۔ جسے عرف عام میں بلیک فورٹ یا قلعہ سیاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے★۔ یہاں پہنچ کر ہمیں پاکستان آرمی کی 611ء فیلڈ انویسٹی گیشن یونٹ کے حوالے کر دیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی ہمارا وہ طویل ترین پیدل سفر اختتام کو پہنچا جو ہمیں اپنے مقدس مشن کے سلسلے میں اختیار کرنا پڑا تھا۔ تکنیکی لحاظ سے یہ ایک ایسی چال تھی جس میں منصوبے کے مرحلے کا ایک ایک قدم انتہائی احتیاط اور ہوشمندی کے ساتھ اٹھایا جانا تھا۔ قدم قدم پر خطرات کا سامنا تھا جن کی پیش بینی اور پیش بندی ضروری تھی۔ آخر ہم کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ ایک ایسی کامیابی تھی جو ہم نے ایک ایسے دشمن کے خلاف حاصل کی تھی جو ہم سے کہیں زیادہ طاقتور تھا اور جس کے وسائل لامحدود تھے اور جو ہر لحاظ سے چوکنا تھا۔ یہ ایک ایسی کامیابی تھی جس نے میرے اندر نئی امیدیں اور نئی اُمنگیں پیدا کر دیں اور جس نے مادرِ وطن کی آزادی کے لیے میرے اس جذبے کو اور میرے عزم کو اور پختہ کر دیا تھا۔ جس کا عہد میں نے قومی محاذِ آزادی میں شمولیت کے وقت کیا۔ اب میں اپنے آپ کو زیادہ پُر اُمید اور زیادہ پُر اعتماد محسوس کر رہا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ میں اِس مقصد کے حصول کے لیے اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکوں گا۔ مقصد کی صداقت اور اِس کے حصول کے لیے صحیح خطوط پر جدوجہد پر میرا ایمان اور پختہ ہو گیا تھا۔ یہ ایک انتہائی مسرت وانبساط کا موقع تھا اور

★۔ مظفر آباد کا یہ تاریخی قلعہ گوجرہ میں واقع ہے۔ یہ عسکری اور دفاعی اہمیت کے پیش نظر تعمیر کیا گیا تھا۔ لیکن آزاد کشمیر پر پاکستانی تسلط کے بعد یہ قلعہ پاکستانی فوج نے اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ اس قلعے میں خفیہ ایجنسیوں نے اپنے دفاتر قائم کئے اور اُسے ایک ٹارچر سیل یا قید خانے میں بدل دیا۔ یہاں تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے عظیم راہنماؤں کو پابندِ سلاسل رکھا گیا اور انھیں جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ سیاسی قیدیوں اور آزادی پسندوں پر یہاں جو مظالم کے پہاڑ توڑے گئے اسی وجہ سے اس قلعے کو Black Fort یا قلعہ سیاہ کا نام دیا گیا۔

میں بہت خوش تھا۔آخر کار میں بخیر و عافیت اپنے گھر واپس پہنچ گیا تھا۔موت کے پنجوں میں جکڑے ہوئے ایک شخص کے لیے اس سے زیادہ خوشی کا مقام اور کیا ہوسکتا تھا۔لیکن میری یہ خوشی بہت عارضی ثابت ہوئی۔جلد ہی بلیک فورٹ میں، میں ایک نئی صورت حال سے دوچار تھا۔ایک ایسی صورت حال کہ جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔اور سوچ کی نئی نئی راہیں اور دریچے کھلتے گئے۔میرے لیے یہ سمجھنا دشوار ہو گیا کہ اپنا دشمن کون اور دوست کون ہے۔"★

محمد مقبول بٹ

★۔ مظفر آباد کے بلیک فورٹ میں محمد مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں کو FIU کے انچارج میجر فقیر گل خٹک اور اس کے کارندوں نے بے پناہ ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔انھیں طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں دی گئیں۔ان عظیم کشمیری حریت پسندوں کے سری نگر جیل سے فرار کو بھارتی حکومت کی ایک چال قرار دیا گیا۔اپنے من پسند بیان دلوانے کے لئے طرح طرح کے جھوٹ گھڑے گئے۔FIU کی پوری کوشش تھی کہ ان آزادی پسندوں کو دشمن کے ایجنٹ ظاہر کر کے ان سے اپنی مرضی کا بیان لیا جائے اور پوری تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو جڑ سے کاٹ دیا جائے لیکن ان حریت پسندوں کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور یہ سچائی پر قائم رہے۔تفتیش کاروں کے حصے میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہ آیا۔مقبول بٹ اور ان کے ساتھی سرخرو ہوئے۔پاکستانی فوج اور ایجنسیوں کے اس ظالمانہ رویے نے مقبول بٹ کے لئے سوچ و فکر کی نئی راہیں کھول دیں۔سری نگر سنٹرل جیل میں دشمن کے سلوک کے بعد بلیک فورٹ مظفر آباد میں "دوست" کے سلوک نے دشمن اور دوست کی تمیز ختم کر دی۔مقبول بٹ شہیدؒ کے مشن کے پیروکاروں کو چاہیے کہ وہ بھی دوست اور دشمن کی پہچان کرنا سیکھیں۔

پیغامِ سرِ دار

(مقبول بٹؒ تختہء دار سے) خانزادہ محمود احمد (مرحوم)

ایک دن میرے رقیبوں کو ندامت ہو گی
جب میری لاش کسی دار کی زینت ہو گی
میں نے جو راہِ طلب ڈھونڈ کے اپنائی ہے
اِس کی منزل تو کسی روز قیامت ہو گی
پابہ زنجیر جو زنداں میں بکھیری سانسیں
اُن کو آہوں کے دھویں میں گنوا نہ دینا
اُن کو خوابوں کے سرابوں میں چھپا نہ دینا
مشعلِ جاں سے آلاؤ کو جو دہکایا ہے
کسی اندیشے کی ٹھنڈک سے بجھا نہ دینا
اِس کو جذبوں کی ملے صبح تلک تیز ہوا
تہی دامانیء احساس بجھا دے نہ اسے
خون سے پرچمِ آزادی جو لہرایا ہے
اپنے اشکوں سے میرے یارو بھگونا نہ اُسے
اِس لہو رنگ سے پرچم کو اٹھائے رکھنا
اپنی محدود سی نفرت سے بچائے رکھنا
میرا پیغام سرِدار سُلگتی صندل
اپنے سینے میں چھپا لو اِسے خوشبو کی طرح
وادیء گل کے مکینو! میری آواز سُنو
وہی مہجور کے انسانوں کی چیخیں لے کر
تم سے کہتی ہے کہ اِن ظلم کے زندانوں میں
آہٹ و دھوپ کی امید پہ کھو جاؤ نہ

لو نظر آئے گی تو ظلم کے انگاروں کی
اور آہٹ جو سُنی آہنی جھنکاروں کی
بیڑیاں توڑ دو، دیوار گرا دو یارو
آس بھی توڑ دو ،زنداں کو جلا دو یارو
ظلم کی دھوپ میں تم نے ہی جلایا ہے بدن
تازیانے جو سہے سرد ہواؤں کے کبھی
اپنے جسموں سے وہ آثار مٹانے ہیں ابھی
تم نے صدیوں کے بہیمانہ مظالم دیکھے
تم ہی ظالم کے سیاہ چہرے کو پہچانتے ہو
وادیٔ گل کے مکینو ! میری آواز سنو
ظلم کی آگ پہ چھا جاؤ سمندر کی طرح
اور جھلسے ہوئے ویران وطن پہ ہر سو
برف کر طرح گرو ،آگ بجھا دو یارو
میرے جذبوں کی دہکتی ہوئی مشعل لے کر
ارضِ کشمیر کے محکوم انسانوں کو
اک نئے دور ، نئے عزم کا پیغام تو دو
قہر کی برف پگھلتی ہے کبھی آہوں سے
خون کی بارش سے ہی وادی میں بہار آئے گی
میں تو زندہ ہوں، بہار آئے گی،آ جاؤں گا
لالہ زاروں میں کبھی ،سرخ چناروں میں کبھی

O